جداگانہ انتخاب سے پاکستان تک

(ہمارے فرقہ وارانہ فیصلہ کا استدراج)

ایک تاریخی سرگذشت

حالی پبلشنگ ہاوس - دہلی
HALI PUBLISHING HOUSE
DELHI

مظہر علی اظہر (احرار)

بار اوّل

جون سنہ ۱۹۴۴ء

قیمت دو روپے ۸ر

مکتبہ احرار لاہور

(چوہدری) ثناء اللہ بھٹہ پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر مکتبہ احرار لاہور سے شائع کیا

مرحوم چودھری افضل حق کے نام

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

باتیں ہماری یاد رہیں

ہندوستان میں فرقہ وار مسئلہ کچھ آج ہی سے نہیں بلکہ طویل عرصہ سے اندرونی اضطراب اور بیرونی اقتدار کا باعث بنا ہوا ہے وقتاً فوقتاً اس عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی کے لئے جو کوششیں ہوئی ہیں اور پھر جن ہوشربا حالات کی کھکڑیں اُٹھانی پڑی ہیں وہ بجائے خود ایک تلخ اور سبق آموز داستان ہیں۔

اس مبحث پر مختلف العقائد اور مختلف الخیال سیاستدانوں اور صحافی حضرات نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے جس تجزیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور اپنی اصابت فکر کی بدولت مسئلہ زیر بحث کی تصریحات جس عالمانہ انداز میں حوالۂ قلم کی ہیں اسے ہم تاریخی طور پر ہندوستانی سیاسیات کے موضوع کی پسندیدہ مساعی قرار دے سکتے ہیں لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے ہماری اکثر کاوشیں اس لئے اُدھوری رہ جاتی ہیں اور ان کی افادیت بھی اسی خاطر آوازۂ صحرا ہو جاتی ہے کہ یا تو ہمارا ذہن ایک خاص "تصوریت" سے اِدھر اُدھر ہونا گوارا نہیں کرتا اور یا ہم اپنی متعینہ راہ سے الگ رہ کر منصفانہ سوچ کے عادی نہیں ہیں۔

چنانچہ اب تک فرقہ واریت پر جتنی کتابیں بھی طبع ہوئی ہیں قطع نظر اس سے کہ مصنّفین کا ذہنی میلان کیا تھا اور ان کے ذاتی عقائد کس نظریۂ حیات سیاسی سے وابستہ ہیں ــــ فی الحقیقت چند کتابیں مورخانہ سعی کہلانے کی مستحق ہیں اور بعض حل مشکلات کا مخلصانہ پہلو اختیار کئے ہوئے ہیں، اس وقت ان کتابوں کی اچھائی اور بُرائی کا تنقیدی جائزہ مقصود نہیں اور نہ اس امر کی وضاحت درکار ہے کہ اس الجھاؤ کی شاخیں کہاں سے پھُوٹتی ہیں اور کہاں تک پہنچتی ہیں۔ دنیا اپنے آغاز سے اب تک اور ہمیشہ کے لئے "قانون تبدیلی" کی پابند ہے وہ کسی خاص شے کی کیفیت مستقلہ نہیں ــ جیسے برف میں ٹھنڈک اور آگ میں گرمی ــ بلکہ اس کی نیچر ہمیشہ ادلتے بدلتے حالات سے پہچانی گئی ہے اور یہ قاعدہ کلیہ اس کے لئے ناگزیر ہے۔

آج اگر ہمارے ملک کا ذہنی ادراک، تاریخ ماضی کے ذہنی ادراک سے مختلف و متبائن ہے تو اس کی وجہ حالات کے وہ پینترے ہیں جنہیں ارض و سما کی گردشیں ہمیشہ سے پالتی آرہی ہیں، فرقہ واریت اور اس کی تدریجی نشو و نما بھی انہیں گردشوں کا لازماً نتیجہ ہے جسے آج کل کی علمی سیاسی اصطلاح میں "تاریخی تقاضہ" بھی کہتے ہیں۔

عام طور پر اور جیسا کہ صحیح ہے "فرقہ وارانہ مسئلہ" غیر ملکی سامراج کی حرکت مذبوحی سمجھا جاتا ہے اور اس سوال کے ساتھ جس قدر بھی ضمنی مباحث تعلق رکھتے ہیں انہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی "شجر ممنوعہ" کے برگ و بار کہا گیا ہے ــــ ! فارسی میں ایک ضرب المثل ہے "رموز مملکت شاہاں بدانند" لیکن اس زمانہ میں جبکہ عوام

کا ذہن "خود شناس و خود نگر" ہو چکا ہے اور "توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب" کا جذبہ لئے ہوئے تحریکیں اُبھر رہی ہیں، اسرار مملکت اب عوامی اذہان کی جاگیر ہو گئے ہیں اور عامہ ناس جانتے ہیں کہ ــــ حکومتیں کیوں اور کیا ہیں ــــ؟ اس پہچان نے لوگوں کو اتنا مضبوط و مستحکم بنا دیا ہے کہ میکیا ولی کی "ذرّیات" اپنی واضح اشکال کے باعث کہیں بھی نگاہ عامہ سے اوجھل نہیں ہوئی ہیں چنانچہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی اب ایک سربستہ شاہی راز نہیں بلکہ ایک کھلا بھید ہے جو ہندوستان کی فرقہ واریت میں برطانوی آئینِ حکومت کا سب سے عظیم اور سب سے بھدا باب ہے چنانچہ اب تک فرقہ واریت نے ملک کے طول و عرض میں جتنے مرحلے بھی طے کئے ہیں ان کی پخت و پُز میں ایک خاص اور اہم حصّہ ــــ اگرچہ اس کی موضوعی نوعیت مسئلہ کی تعمیری نوعیّت سے مختلف ہے ـ ہماری حکمران جماعت کے سامراجی مقاصد کا اثر یافتہ ہے۔

"ــــ یہ سب کچھ اپنے دوائر میں درست ہے اور اس پر مزید حاشیہ آرائی فضول محض اصل سوال مسئلہ کی موضوعی حیثیت ہے جب پارینہ سیاسی نظریوں کی قدریں تاریخ کے کھنڈروں میں جگہ پا چکی ہیں اور نئی دریافتیں نئے ماحول پیدا کر رہی ہیں تو یگانہ شعور رکھنے والی مستقل قوم جو عددی اعتبار سے ہندوستان کے آسمان کی نیلی چھت کے نیچے ۹ کروڑ انسانوں کی ایک ناقابل فراموش جمعیت ہے اور پھر یہ آبادی اُن ملکوں سے کہیں زیادہ ہے جو دنیا میں ان دنوں معیشت، معاشرت

تمدّن وتہذیب، فلسفہ وعلم، عروج واقبال اور ریاست وسلطنت کی فضیلتوں کے مالک ہیں تو اس قوم کی "انفرادیت" سے اجتناب برتنا اور یہ سمجھنا کہ انفرادیت کے معنی چند سرکاری ملازمتوں کا حصول، حکومتی اداروں میں نیابت اور تجارتی ومعاشی اغراض ومصالح کا تصادم ہے ایک ایسی ذہنی اُپج ہے جو امراض دماغی کے شفاخانے ہی میں صحت یاب ہو سکتی ہے۔

ایک وقت تک تھا جب ہندو مُسلم اتحاد کی پہلی کوشش کے موقعہ پر شملہ میں پنڈت مدن موہن مالوی جی نے کہا کہ مجھے آج تک اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں کوئی جُداگانہ حقوق بھی رکھتے ہیں اور ان کا مفاد ہندوؤں سے مختلف ہے لیکن جیسا کہ وقت کی فطرت ہے کہ وہ اپنی سچائی بدیر یا سویر منوا لیتا ہے آج ہر چھوٹے بڑے کی زبان "جُداگانہ احساس" کے اظہار اور اقرار پر مجبور ہے چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو اپنے ایک مضمون میں لکھ چکے ہیں کہ

"ہر شخص فرقہ وارانہ مسئلہ کی اہمیّت کو تسلیم کرتا ہے لیکن جس انداز میں پیش کیا جا رہا ہے وہ دراصل اصل مسائل سے گریز کرنے کا پردہ ہے۔"

مولانا مظہر علی صاحب اظہرؔ نے جن کی خداداد قابلیّتیں مسلّمہ ہیں اور جنہیں ہندوستانی سیاسیات کے نشیب وفراز میں خود حصّہ لینے اور مسائل کو عملی طور پر جانچنے کے قریب قریب تمام مواقع میسر آئے ہیں اس کتاب میں تجرباتی اور تجزیاتی طور پر جن تواریخی واقعات کو قلمبند کیا ہے اور پھر توضیحات کی جو عمارت جُداگانہ

انتخاب کی چند نشستوں سے لے کر تقسیم ملک کے پاکستانی مطالبہ تک اُستوار کی ہے اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مفروضات کی دُنیاؤں میں رہنے والے نظری سیاستدان کہاں ہیں؟ ان کے نزدیک معیار سیاست کیا ہے اور ان ذومعنی الفاظ کی اقدار کیا ہیں جو سیاسیات کی ٹکسال میں ڈھلتے ہیں۔

محترم مولانا نے مسئلہ زیر بحث کو نہ تو تھکا دینے والی سیاسی مصطلحات سے بوجھل اور دور از کار مبحث بنایا ہے اور نہ اپنوں کی خوشی اور پرایوں کی ناراضی کے خیال سے آرائش الفاظ کی چیستان بنانی چاہی ہے ان کے اسالیب بیان بالکل سادہ ہیں اور مطالب بیان ایک نظر ہی میں ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

ان کے ہاں مسئلہ کا پہلو ہی دوسرا ہے جداگانہ انتخاب، مخلوط انتخاب، وطنیت، قومیت ثقافتی وقوف، تہذیبی امتیاز، تمدنی اختلاف، مذہب کی قدح، عقائد کی کشمکش، خیالات کا ٹکراؤ، بین الملی تصوّر، قرون ماضیہ کی تاریخ کے ابواب اتحاد، معاشیات کا ارتقا وحدت ملکی، جغرافیائی تقسیم، ثقافتی ملاپ اور نفاق، لسانی تضاد، وحدانی حکومت، وفاقی نظریہ، صوبائی اور وطنی بٹوارے اور اس قطع کے دوسرے مباحث۔ مدبروں کی بحثا بحثی، اخباروں کی کٹا چھنی، قومی اداروں کی گہما گہمی اور راہنماؤں کی ہماہمی سے ایسی فضا پیدا کر چکے ہیں کہ خود علاج مرض بن گیا ہے اور ہمارے ملک کی فرقہ واریت "امربیل" کی طرح روز بروز بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔

صوبائی احرار کانفرنس سیالکوٹ منعقدہ جولائی ۱۹۴۱ء میں مولانا محترم نے صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا

ان ہندوؤں سے جو ہندوستان کو ایک واحد اور ہندوستانیوں کو ایک قوم

کہتے ہیں میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے گذشتہ بیس برس میں اپنی دلی کیفیت ایسی ہی بنائی ہے جو ایک قوم یا ایک وطن ہونے کا قطعی ثبوت دیتی ہو...... ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نہ وطن کا لفظ امن کا ضامن ہے اور نہ قوم کا لفظ صلح کا کفیل۔ ایک ہی گھر میں ماں جایوں کا اختلاف بھائی کو بھائی کا دشمن بناتا ہے اگر ایک ماں باپ کی اولاد ہونا امن کا ضامن نہیں ہو سکتا اور ایک ہی گھر میں رہنا اس گھر کو خونریز واقعات سے نہیں بچا سکتا تو چالیس کڑور انسانوں کی آبادی کو قوم و وطن کے دلفریب الفاظ سے بہکانے کی کوشش کوئی مفید اور پائدار نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر بھائی بھائی کی عزت کا محافظ، دولت کا امین اور زندگی کا خیر خواہ ہے تو وہ امن سے رہ سکتے ہیں اسی طرح اگر کسی سرزمین کے بسنے والے ایک دوسرے کی عزت کے پاسبان، دولت کے امین اور زندگی کے خیر خواہ ہیں تو وہ آرام اور امن کی زندگی بسر کر سکتے ہیں ورنہ ایک قوم سے ہونا، ایک مذہب سے ہونا، یا ایک جغرافیائی حدود میں بسنا یا ایک مشترکہ تاریخ کا وارث ہونا انہیں جنگ و جدال سے نہیں بچا سکتا وطن اور قومیت کی اگر کوئی بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ ایثار اور خیر خواہی پر قائم ہو سکتی ہے، جغرافیہ، تاریخ، رنگ اور زبان پر نہیں ہو سکتی۔ جہاں مفاد کی ٹکر ہو گی وہاں وطن اور قومیت قیام امن میں ناکام رہیں گے۔

ہمارے فرقہ وارانہ فیصلہ کا استدراج جس کا ثانوی نام جداگانہ انتخاب سے پاکستان تک ہے اسی تلخ نوائی کی تاریخی رنگ میں واقعاتی شرح ہے اور اُن

تاروں پر براہِ راست ضرب ہے جو ابھی تک شرمندۂ مضراب نہیں ہوئے ہیں۔ اور جنہیں ہمارے نیشنلسٹ پریس نے اپنی مجرمیت کے خوف سے ہمیشہ کے لئے ایک ورقِ گمشدہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔

غور کیجئے کہ اس سوال کی اصل کیا ہے، آغاز کیسے ہوا، درمیان میں کون کون مرحلے آئے، کہاں کہاں اتصال ہوا، اور پھر کن کن مخالف ہواؤں نے بساطِ چمن اُلٹنا چاہی ـــــ وہ لوگ جو ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستان کی آزادی کا سنگِ بنیاد یقین کرتے ہیں اور پھر خود ہی فرقہ وارانہ آگ کو اپنے دامن سے ہوا دیتے آئے ہیں، کب تک اور کیونکر ان حقائق سے چشم پوشی اختیار کر سکتے ہیں جنہیں مولانا مظہر علی صاحب اظہرؔ نے ایک نظری مفکّر کی بجائے عملی راہنما کی حیثیت سے خود حالات کے ذاتی مشاہدہ پر لکھا ہے۔ اس ساری کتاب کی خوبی یہ ہے کہ نہ تو قیاسات پر کوئی دیوار کھڑی کی گئی ہے اور نہ یکطرفہ خیالات کو دلیل قاطع سمجھ لیا گیا ہے اور نہ جانبدارانہ آلائشوں ہی سے صداقت زخمی ہوئی ہے۔ ورنہ بقول غالب ؎

غلطیہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالوں کو رسا باندھتے ہیں

مولانا محمد علی مرحوم نے غالباً کراچی میں فرقہ وارانہ مناقشہ کا شخصی پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"Those Hindus who pose themselves as a nationalist are communalists and those muslims who pose themselves as a communalists are self seeker."

"وہ ہندو جو اپنے آپ کو قوم پرور کہتے ہیں فی الحقیقت فرقہ پرست ہیں اور وہ مسلمان جو خود کو فرقہ پرور کہتے ہیں، خود غرض ہیں۔"

یہ کتاب انہیں دو بڑے طبقوں کے حقیقت حال کا ایک تاریخی مرقع ہے جو کہیں بھی رو رعایت سے آلودہ نہیں ہوا ہے ؎

حق گوئی و بے باکی آئین جواں مرداں
اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

شورش کاشمیری

پیش لفظ

میں مارچ ۱۹۴۱ء میں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی سے رہا ہوا۔ تو اس کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں تیار ہو چکا تھا اور ہندوستانی سیاسیات کے پلٹے روز بروز فرقہ وارانہ مسئلہ کی اہمیّت کو بڑھا رہے تھے۔ جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے میں نے حتی الوسع واقعات کا کوئی گوشہ تشنۂ بحث نہیں چھوڑا ہے اور جو کچھ شاہراہ سیاست کے سفر میں دیکھا ہے اسے بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔

اس کتاب کے بہت سے حصّے بالاقساط "زمزم" میں چھپ چکے ہیں اور اب مزید اضافہ و ترمیم کے ساتھ اسے ایک موضوعی کتاب کی شکل دی گئی ہے!!

چونکہ سیاست انسانی زندگی کا ایک ایسا شعبہ ہے جو دوسرے شعبوں سے بالکل مختلف ہے اس لئے اس پر ہم کوئی مستقل حکم نہیں لگا سکتے ہیں۔ اور پھر حالات اتنی سرعت سے بدلتے ہیں کہ بعض اوقات دماغ خود اپنے گوشۂ فکر کے لئے ایک بار محسوس کرتا ہے کہ ع

یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے

جنگ کے ان نازک دنوں میں ہمارے یہ "فرقہ وارانہ اختلافات"

کتنے پھیلے اور بڑھے ہیں، لطف یہ کہ ہر شخص اس کی شدت کا قائل ہے۔
اور اس قضیئے کو نپٹانا بھی چاہتا ہے لیکن جس دروازے سے داخل ہو کر،
ہمارے بعض اونچے سیاست دان صورت حال کو سلجھانا چاہتے ہیں
اُس سے فرقہ واریت کی گرہیں روز بروز بندھتی اور گنجلک ہوتی چلی جا رہی ہیں
چنانچہ اس وقت اصلاح حال کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں انہیں یا تو
اندرونی تضاد و تخالف کی وجہ سے نشو و نما کا مادہ ہی نہیں تھا اور یا
حالات کا اتنا غلط جائزہ تھا کہ ۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

اصل شکایتی امر جس سے ہمارے اربابِ سیاست آنکھیں بند کئے
ہوئے ہیں یہ ہے کہ اُنہوں نے آج تک حالات کا مخلصانہ مطالعہ ہی نہیں
کیا۔ اور اگر کبھی نشیب و فراز پر نگاہ بھی ڈالی ہے تو نتائج اخذ کرنے میں
ان کی فکر نے شدید غلطیاں کھائی ہیں، اور یہی غلطیاں بڑھتے پھیلتے
مسئلہ مابہ النزاع بن گئی ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہمارے اچھے اور سمجھدار کارکن حتیٰ کہ ایسے
لوگ جن کی رہنمائی پر ملک و قوم کے افراد اعتماد ہی نہیں بلکہ اعتماد
بھی رکھتے ہیں، اس حد تک فرقہ واریت کے موضوعی تسلسل سے بیگانہ

اور بے بہرہ ہیں کہ تعلیم و تجربہ کے شاندار ریکارڈ کے باوجود ان کی گفتگوئیں یا تو جذبات محض ہوتی ہیں اور یا ان کے دلائل میں صحیح حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے ذہنی تقاضوں اور سیاسی ضرورتوں کو پرکھتے ہوئے میں نے اس کتاب کی تدوین کو ضروری خیال کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے تئیں نہ تو حالات کی باقاعدہ ترتیب کو ضائع ہونے دیا ہے اور نہ کسی "پسِ پردہ" جذبے سے قلم کو داغدار کیا ہے۔

میرا مقصد اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا، یعنی حالات کا صحیح مطالعہ، حقائق تک بالواسطہ رسائی، معاملہ فہمی کا درک اور سچائی کا بے خوف اعلان۔

جن دنوں یہ مضامین "زمزم" میں چھپتے تھے اُن دنوں پنجاب اور بیرونِ پنجاب کا قومی پریس اور اکثر راہنما اس خواہش کے باوجود کہ ہندو مسلم اتحاد ہندوستان کی آزادی کے حصول کا سنگِ بُنیاد ہے، چُپ سادھے ہوئے تھے اور انہیں تردیدی جواب کا حوصلہ نہ تھا — بلکہ اکثر فہمیدہ ہندو احباب کی زبان پر تھا — کہ ان واقعات سے انکار ناممکن ہے، لیکن اب کیا ہونا چاہئے —!!

اب کیا ہونا چاہئے —؟ اس سوال کا جواب بھی انہیں اوراق

میں موجود ہے صرف سُننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں اور ماننے والے دماغ چاہئیں ——— میری ہندوستانی نیشنلزم سے اقبال مرحوم کے الفاظ میں ایک گذارش ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کرگیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی تھا

۲۱ رمئی ۱۹۴۴ء

مظہر علی اظہر

منظور ہے گذارش احوالِ واقعی

ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے نے گزشتہ بیس برس میں بہت کچھ نشیب و فراز دیکھے ہیں اس سے قبل بھی یہ مسئلہ موجود تھا لیکن اس کی شکل و صورت کچھ ایسی نہ تھی جیسی ان دنوں ہو رہی ہے۔

گو یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستانی سیاست کی جان ہے۔ پھر بھی اس فیصلے کی ہر کوشش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میرے لئے یہ ناکامیاں مایوسی کا باعث نہیں۔ کیونکہ اس عظیم الشان خطۂ زمین میں جسے آج کل ہندوستان کا نام دیا جاتا ہے سب لوگوں کا بڑی آسانی سے ایک مرکز پر آجانا یا کوئی ایسا سمجھوتہ کر لینا جس کو سب لوگ قبول کر لیں کوئی سہل کام نہیں ہے۔

فیصلے کی راہ میں رکاوٹیں

اس فرقہ وارانہ فیصلے کے راستے میں کئی ایک رکاوٹیں ہیں :۔

پہلی رکاوٹ

پہلی رکاوٹ تو اس خطۂ زمین کی وسعت ہے۔ ایسا وسیع علاقہ جس کے عام باشندوں کو ایک دوسرے سے کبھی ملنے یا معاشرتی اور تجارتی تعلقات قائم کرنے کا موقعہ میسر نہ آیا ہو آسانی سے ایک ہی رنگ میں رنگے نہیں جا سکتے۔ ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے سے اس قدر دور افتادہ ہے کہ موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ ذرائع آمدورفت بھی ان میں باہمی ربط پیدا نہیں کر سکتے۔

دوسری رکاوٹ

دوسری رکاوٹ اس ملک کے مختلف مذاہب، مختلف ذاتیں مختلف گوتیں اور مختلف زبانیں وغیرہ ہیں۔ یہ اختلافات معاشرتی۔ تمدنی اور مذہبی یکجہتی قائم نہیں ہونے دیتے اور نہ آئندہ ان سب اختلافات کو یا ان میں سے اکثر کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی صورت بہتری کی ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اختلافات کو عداوت اور عناد کا درجہ حاصل نہ ہو۔ اور باہمی رواداری سے مناقشے کو دور کیا جائے۔

تیسری رکاوٹ

اس ملک میں ایک غیر ملکی حکومت کی موجودگی ہے جس کو اس ملک میں قبضہ و اقتدار حاصل رکھنے سے مادی تقویت اور ایک طرح کی روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت کو ہندوستان کا مالک و مختار ہونے کے باعث یہاں کے ذرائع پیداوار سے فائدہ اٹھانے کا جو موقعہ ملتا ہے وہ تاریخ عالم میں نادر اور بے مثال ہے۔ ایسا سرسبز اور قدرت کے خزینوں اور دفینوں سے مالا مال ملک کم ہی کبھی اس طرح کسی ایسی قوم کے پنجوں میں آیا ہے جو اپنا مرکز اس سے سات ہزار میل کے فاصلے پر بنائے۔ اور اس کی دولت سے اپنے مرکزی

علاقے کی شان وشوکت۔ مال ودولت اور تجارت وصنعت کو فروغ دے۔

ان مادی فوائد کے علاوہ برطانوی شہنشاہی کا تصور ہر برطانی ذہن میں اپنی قومی جاگیر کی وسعت اور زرخیزی کا احساس فخر پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو دنیا کی ممتاز ترین قوم سمجھتا ہے۔ وہ اس خیال ہی سے خوش ہوتا ہے کہ آفتاب عالمتاب ہر وقت سلطنت برطانیہ کے کسی نہ کسی حصّے پر اپنی شعاعوں سے کھیلتا ہے۔

ان حالات میں حکومت کی اعلان کردہ سیاست خواہ کچھ ہو اور وہ اس پر عمل کرنے کے لئے خواہ کچھ ہی وتیرہ اختیار کیوں نہ کرے، یہ احتمال ہر وقت موجود رہتا ہے کہ حاکم افراد ہر وقت اور ہر حال میں اس اعلان کردہ سیاست کو کامیاب بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان حاکم افراد میں بسا اوقات ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے انفرادی خیالات کو قومی حکمت عملی سے جداگانہ اور بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لئے اعلان کردہ سیاست کی کامیابی کے خواستگار نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ لوگ اپنی ریشہ دوانیوں سے ملکی فضا کو مکدر ہونے کا موقعہ دیتے ہیں۔ تاکہ غیر ملکی اقتدار کی ضرورت محسوس ہوتی رہے۔

غیر ملکی حکومت کی ذمّہ واریاں

ہمارا عام وتیرہ یہی رہا ہے کہ ہم نے اپنی ہر کمزوری ہر خامی اور ہر مصیبت کا باعث غیر ملکی حکومت کو سمجھا اور بتایا۔ یہ وتیرہ گو نتائج مرض کے لحاظ سے غلط نہ ہو لیکن تشخیص و علاج کے لحاظ سے ناقص ضرور ہے۔ غیر ملکی حکومت موجود ہے۔ وہ موجود رہنا چاہتی ہے۔ وہ موجود رہنے کی ہر امکانی کوشش کریگی۔ وہ حکومت مہاتما بدھ کی حکومت کی طرح ایک فرد کی حکومت نہیں۔ وہ ایک شہنشاہیّت پسند جمہوریت کی حکومت ہے جس کے باشندے اپنے ملک میں نہ فقط انفرادی آزادی کے خواہاں ہیں بلکہ معاشرتی تمدنی اور سیاسی آزادی کے بھی

علمبردار ہیں۔ لیکن انہیں دوسرے ملکوں میں اقتدار حاصل کر کے اپنی دولت کو بڑھانے اور اپنے معیارِ زندگی کو ترقی دینے کی عادت ہو چکی ہے۔ یہ عادت بھی شراب اور جوئے کی عادت کی طرح چھوڑے نہیں چھوٹتی اور گو منطقی حیثیت سے افراد بخوبی سمجھ بھی لیں کہ ان کی پوزیشن کمزور ہے۔ مگر فوجی قوت کی فراوانی ان کی منطقی کمزوری کی امداد کو آگے بڑھتی ہے۔ اس لئے وہ عادتاً مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی شہنشاہی کو قائم رکھنے کے لئے ہر حیلہ اور ہر بہانہ تراشیں اور الزام ہمیشہ ان قوموں کے سر تھوپیں جو ان کے فوجی اقتدار کا شکار ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مہاتما بدھ کی طرح کے حکمران افراد تو اپنی سلطنت کو چھوڑ کر فقیری اختیار کر لیتے ہیں اور کوئی تنہا انسان تو اس قدر ایثار سے کام لے سکتا ہے۔ یا مادی وسائل کی تلاش کرنے والوں کے نظریہ کے مطابق "ایسی حماقت کا مرتکب" ہو سکتا ہے۔ مگر کروڑوں افراد کی قومیں اپنے لئے ایثار اور فقیری کا یہ راستہ رضامندی سے اختیار نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ہمیں ہر الزام کو حکومت کے سر تھوپ کر بیٹھ جانا فائدہ نہیں دے سکتا۔ کسی حکومت کی پوزیشن کتنی ہی غلط اور کمزور کیوں نہ ہو اس کی قوت اس کی غلطیوں اور کمزوریوں کی پردہ پوش ہے۔

اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہوگا۔ ہمیں حکومت کی رہنمائی اور داد و دہش سے بے نیاز ہو کر اپنا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ ہمیں خود اپنے مرض کی تشخیص کر کے اس کے علاج کے درپے ہونا ہوگا۔ الغرض ہمیں حکومت کے رویے اور حکمت عملی کو نظر انداز کر کے ـــــ نہیں بلکہ اس پر نظر رکھ کر اور اس کے باوجود ـــــ اپنے رویے اور حکمت عملی کو ایسے طریقے پر ڈھالنا ہوگا۔ کہ ہم غیر ملکی اقتدار سے بھی بے نیاز ہو سکیں اور اپنے ملک میں امن و عافیت اور خوش حالی و یگانگت کا دور قائم کر سکیں۔

حکومت نے ہندوستان میں کیا کچھ کیا۔ اور اس کی حکمت عملی سے کون کون نتائج

برآمد ہوئے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس بارے میں کوئی زیادہ اختلافات نہیں ہیں اس سلسلۂ مضامین میں اس موضوع پر بحث کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ سوائے اس کے کہ کوئی خاص مسئلہ ایسا درمیان میں نہ آجائے۔ جو کچھ کہنا ناگزیر کر دے۔

البتہ مجھے یہ دکھانا پیش نظر ہے کہ ہم نے اپنی کمزوریوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے کیا کیا راستے اختیار کئے۔ اور ہم برسوں کی جانفشاں جدوجہد کے بعد کس طرح پہلے سے بھی زیادہ پریشان اور آوارہ حال ہو کر اپنے گھروں کو بیابان اور اپنے بازاروں کو جوئے خوں بنا رہے ہیں۔

ہمارے مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اختلافات نے ہمارے راستے میں بہت روڑے اٹکائے ہیں۔ اور ہماری بیش بہا قربانیوں کو بظاہر بیکار کر دیا ہے مجھے ان مختلف مسائل کے بعض پہلوؤں پر تبصرہ کرنا ہے۔ مگر میں قدرے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ سب سے پہلے سیاسی مسائل کی طرف دھیان دینا چاہئے۔ کیونکہ سیاسی مسائل ہی سب سے زیادہ اہم اور پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ اور سیاسیات کی بڑھتی ہوئی کشمکش ہی ایسی صورت اختیار کر رہی ہے کہ

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اگر سیاسی مسائل میں درست زاویہ نگاہ قائم ہونے لگے۔ تو باقی مسائل آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب تک سیاسی مسائل طے نہ ہوں باقی مسائل معاملات کو الجھانے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ انہیں سلجھانے میں کارآمد اور مددگار ثابت نہیں ہوتے۔

میں یہ بھی کہہ دوں کہ ان مضامین کو میں ذاتی ذمہ داری پر قلمبند کر رہا ہوں۔ اور یہ کسی

اجتماعی کاوش فکر کا نتیجہ نہیں۔ دوسرے اس مضمون کو حوالہ قلم و قرطاس کرنا اس لئے بھی ضروری تھا۔ کہ بہت سے نوجوان جو گذشتہ بیس برس کی اندرونی سیاسی کش مکش سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے۔ انہوں نے بعض اوقات ان مسائل پر مبسوط تبصرے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔

اگر احباب میرے بیانوں میں کوئی غلطی یا غلط فہمی یا بعض تفاصیل سے عدم واقفیت محسوس فرمائیں۔ تو وہ براہِ کرم مجھے اطلاع دیں۔ تاکہ میں ان کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں۔

مُسلم لیگ کانگریس میثاق

سیاسی معاملات کے بارے میں فرقہ وارانہ فیصلے کی بہت سی کوششیں ہوئی ہیں۔ مگر ان میں سے چند ایک کا ذکر اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے ضروری ہے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ کی ایک ہی کوشش ایسی ہوئی ہے۔ جو حقیقی طور پر اس حد تک کامیاب ہوئی۔ کہ ہندوؤں میں اس کے خلاف کوئی خاص ایجی ٹیشن نہ ہوئی۔ اور مسلمانوں میں بھی معمولی اختلاف کے علاوہ کوئی فوری ہنگامہ برپا نہ ہؤا یہ فرقہ وارانہ فیصلہ سنہ ۱۹۱۶ء کا مسلم لیگ کانگرس میثاق ہے۔

یہ فیصلہ اور اس کے گردوپیش کے حالات ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ اور ان سے کئی ایک سبق حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا سبق

اس فیصلہ کی بنا جداگانہ انتخاب پر تھی مُسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے جُداگانہ انتخاب پر مہر تصدیق ثبت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ برطانوی حکومت کو بھی جداگانہ انتخاب

کی اصولی مخالفت کے باوجود اسی پر عمل درآمد کرنا پڑا۔

فرقہ وارانہ انتخاب کی مذمت کرنے والے ہندو پہلے بھی موجود تھے۔ مگر لکھنؤ کے ۱۹۱۶ء کے مسلم لیگ کانگریس پیکٹ میں جداگانہ انتخاب کو منظور کرتے وقت مخلوط انتخاب کو نظر انداز کیوں کیا گیا۔ اور ہندو فرقہ نے اس کو بطیب خاطر کیوں قبول کیا؟ اس سوال کے جواب کے لئے ایک اور معاملہ کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

دوسرا سبق

دوم ۱۹۱۶ء کے میثاق کا دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلم قوت کے توازن کی خاطر مسلم اقلیت کے صوبوں سے فیاضانہ اور مسلم اکثریت کے صوبوں سے بخیلانہ (بلکہ اس سے بھی بدتر) سلوک کیا گیا۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں پاسنگ Weightage کے اصول کو مدِّ نظر رکھا گیا۔ یعنی ان کو آبادی کے لحاظ سے زیادہ نشستیں عطا کی گئیں۔ مثلاً یو۔ پی میں ۱۴۔ فی صدی آبادی کو تیس فی صدی نشستیں صوبہ جاتی مجلس واضع قوانین میں دی گئیں۔

اس زمانے میں صوبہ سرحد میں کسی اصلاح کے رائج ہونے کی اُمید نہ تھی۔ بلوچستان بھی اسی حالت میں تھا۔ سندھ کا علاقہ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ اور وہاں کی مسلم اکثریت بمبئی کی ہندو اکثریت کے مقابلے میں اقلیت بنی ہوئی تھی۔ اس طرح پوزیشن یہ ہوئی کہ یو۔ پی۔ سی۔ پی۔ بہار۔ آسام۔ بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں مسلمانوں کو اپنی تعداد کے تناسب سے کچھ نہ کچھ زیادہ حصہ مل گیا۔

مگر ہندوؤں کی جانب سے یہ فیاضی بلامعاوضہ نہ تھی۔ مسلم اقلیت کو مختلف صوبوں میں پاسنگ دینے کے ساتھ ہی مسلم اکثریت کے دو صوبوں پنجاب اور بنگال کی باری بھی

آئی۔ مُسلم اکثریت کے ان دنوں یہی دو صوبے تھے۔ ان میں مُسلم اکثریت ۵۶۔ اور ۵۵ فی صدی تھی مُسلم اقلیت کے صوبوں کے پاسنگ کا معاوضہ یہاں سے لیا دیا گیا۔ پنجاب میں مسلمانوں کو ۵۰ فی صدی نشستیں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور بنگال میں فقط ۴۰ فی صدی نشستیں ہی ان کے حصّہ میں آئیں۔

تیسرا سبق

سوم۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں پاسنگ اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس اکثریت کو مساوات یا اقلیت میں تبدیل کرنے کا فارمولا قبول کیوں کیا گیا۔ اس معاملے میں عام طور پر فقط ہندوؤں کو ملزم ٹھہرایا گیا ہے۔ کہ انہوں نے مُسلم اکثریت کا خون کر دیا۔ مگر میں اس فارمولا کی تاریخی تفسیر میں فقط ایک ہی فریق کا ہاتھ نہیں دیکھتا۔ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو قربان کرنے کا فرض مسلم لیگ اور اس کے مُسلم نمائندوں نے بھی ادا کیا۔ ہندوؤں نے ۱۹۱۶ء کے اس میثاق کو مسلمانوں سے جبراً نہ منوایا تھا۔ بلکہ فریقین کی رضامندی شاملِ حال تھی۔ اس لئے مشترکہ ذمّہ واری سے مفر نہیں۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کے ساتھ ایسا سلوک کیوں ہُوا۔ مسلمانوں کی سیاست پر ہمیشہ مُسلم اقلیت کے صوبوں کا اثر غالب رہا ہے۔ اور آج بھی وہ غالب اثر زائل نہیں ہو سکا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ مجھے اس وقت ان وجوہات سے بحث کرنا مطلوب نہیں۔ چونکہ مُسلم لیگ میں مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ اور پنجاب و بنگال کے مسلمان لاوارث سے تھے۔ اس لئے تمام ہندوستان کے ہندوؤں اور مُسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے مفاد متوازی تھے۔ مُسلم اقلیت کے صوبے پاسنگ کے خواہش مند تھے اس سے ان کو اسمبلیوں میں چند زائد نشستیں حاصل ہوتی تھیں۔ اور چند اقتدار پسند گھرانوں

کی باہمی رقابت میں کمی واقع ہونے کی گنجائش تھی۔ اس لئے انہوں نے پاسنگ کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا۔

ہندوؤں کو اس پاسنگ سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ کیونکہ یو۔پی میں سب سے زیادہ پاسنگ حاصل کرنے کے بعد بھی مسلمان سنو۱۰۰ میں سے تیس۳۰ نشستیں ہی حاصل کر سکتے تھے۔ اور ۳۰ اور ۷۰ کا مقابلہ کسی قانون ساز ادارے میں جو جمہوریت کے اصولوں کی بنا پر چلتا ہو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یو۔پی میں ۷۰ نشستیں ہندوؤں کو جداگانہ انتخاب سے مل جائیں۔ تو ہندو مفاد کو کسی وقت بھی ۳۰ مسلم نشستوں سے خواہ وہ جداگانہ انتخاب ہی سے کیوں نہ پُر ہوں، کوئی خطرہ نہ ہو سکتا تھا۔ مسلم اقلیت کے باقی صوبوں میں مسلمانوں کی بے بسی یو۔پی سے بھی نمایاں تر تھی۔

اس پاسنگ کے عوض میں مسلمانوں نے پنجاب میں اپنی اکثریت کو مساوات میں بدلنا منظور کیا اور بنگال میں تو ۴۰ فی صدی پر قناعت کر کے اپنی دانش مندی کا بیش بہا ثبوت دیا

اس مقام پر مجھے یہ کہنے سے بھی احتراز نہ ہونا چاہئے۔ کہ مسلمانوں کی سیاسی حالت ان دنوں مسلم اقلیت کے صوبوں میں بہتر تھی۔ پنجاب اور بنگال دونوں خوابِ خرگوش میں تھے گویا جہاں کہیں مسلمان زیادہ تعداد میں تھے وہیں وہ پس افتادہ اور فلاکت زدہ تھے۔ بنگال کے مسلمانوں کو خود مساوات یا اکثریت حاصل کرنے کا خیال یا حوصلہ نہ تھا۔ اور مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلم سیاست دانوں کو ان کے لئے چالیس فی صدی سے زیادہ مانگتے شرم آتی تھی۔ اس سے کچھ بہتر حالت پنجاب کی تھی۔ مگر میدان سیاست میں دونوں پیچھے اور اپنی ہستی اور مفاد سے بے بہرہ تھے۔

اس طرح پنجاب اور بنگال کے حقوق کو مُسلم اقلیت کے صوبوں کی خاطر قربان کر

دیا گیا۔ ہندوؤں نے تو اس پر خوش ہونا ہی تھا۔ مگر مسلمانوں میں بھی اس فیصلہ کے خلاف کوئی خاص آواز بلند نہ ہوئی۔

چوتھا سبق

چہارم۔ اب ہم اس سوال کا جواب دینے کے قابل ہیں۔ کہ ہندوؤں نے ۱۹۱۶ء میں جداگانہ انتخاب کو کیوں قبول کیا۔ چونکہ مسلمانوں کی کمزوری اور کوتاہ بین سیاست نے اقلیت کے صوبوں میں پاسنگ قبول کر کے اکثریت کے دونوں صوبوں ہی کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اس لئے ہندوؤں کو کسی صوبہ میں بھی مسلم اکثریت نظر نہ آتی تھی۔ ایسی حالت میں اور کونسا فارمولا ان کو اس سے زیادہ پسند آسکتا تھا۔ وہ سارے ہندوستان میں مرکز پر جہاں کبھی خدشہ کا گمان نہ تھا، اور صوبوں میں جہاں کبھی خدشہ ہو سکتا تھا، میدان صاف پاتے تھے۔ جب انہیں جداگانہ انتخاب سے سب صوبوں میں فائق پوزیشن حاصل ہو جائے۔ تو وہ جداگانہ انتخاب سے کیوں ڈریں۔ اگر ڈر ہو سکتا تھا۔ تو بنگال یا پنجاب کے مسلمان کو ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہندوؤں کی فراوانی دولت ان کی ترقی و تعلیم ان کی وسعت نظام ان کو پنجاب میں بھی مساوات کے باوجود فائق حیثیت کی اُمید دلا رہی تھی۔

الغرض ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ کا میثاق اوّل سے لے کر آخر تک ہندو حقوق کا محافظ تھا۔ اور پنجاب اور بنگال میں مُسلم حقوق کو نظر انداز کرتا تھا۔ مگر اپنی کوتاہ اندیشی کا مداوا مسلمان خود کرتے یا نہ کرتے، وہ کر سکتے یا نہ کر سکتے۔ ہندوؤں ہی نے ان کی اس بارے میں امداد کی اور اب آپ کو ہم وہ داستان سُناتے ہیں جس نے لکھنؤ کے اس معاہدے کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں۔

پنجاب میں مُسلم راج کا غوغا

لکھنؤ کے سنہ ۱۹۱۶ء کے کانگرس مسلم لیگ سمجھوتے کو مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ میں اساس آئین تسلیم کر لیا گیا لیکن عملدر آمد کی تفصیلات میں اس کی ہیئتِ کذائی بھی کسی قدر بدل گی۔ پنجاب میں انتخابی حلقے مقرر کرتے وقت ان کو عام اور خاص حلقوں میں میں تقسیم کیا گیا۔ باقی صوبوں میں بھی ایسا ہی ہؤا لیکن اس وقت مجھے فقط پنجاب کی روداد بیان کرنا ہے

عام اور خاص حلقوں کا نتیجہ

حکومت نے حلقہ ہائے انتخاب کو عام اور خاص حلقوں میں تقیم کرتے وقت ہندو رائے عامہ کا تھوڑا سا پاس کیا یعنی اس نے لکھنؤ کا تناسب عام حلقوں میں تو قائم رکھا مگر خاص حلقوں میں اس تناسب کو نظر انداز کر دیا گیا۔

پنجاب کونسل میں ۷۱ انتخابی نشستیں تھیں۔ ان میں سے ۶۴ نشستیں جن میں شہری اور دیہاتی شامل تھیں، عام نشستیں قرار دی گئیں اور ۷ نشستیں خاص قرار دی گئیں۔ عام

نشستوں میں سے ۳۲ مسلمانوں کو دی گئیں۔ اور ۳۳ دوسرے فرقوں یا قوموں کو۔

سات خاص نشستوں میں فرقہ وارانہ تناسب نہ تھا بلکہ ان کو مخلوط انتخاب سے پُر کرنا تھا ان نشستوں میں سے ایک تمنداروں کا حلقہ تھا جس کا تعلق ضلع ڈیرہ غازی خاں کے چند بڑے بڑے زمینداروں سے تھا۔ یہ نشست چونکہ مسلم رائے دہندوں پر مشتمل تھی اس لئے اس میں مخلوط انتخاب کی گنجائش نہ نکلی۔ اور یہ ہمیشہ مسلمانوں کا حصّہ رہی۔ باقی چھ نشستوں میں سے تین تو بڑے بڑے زمینداروں کی تھیں جو پانسو روپیہ سالانہ یا اس سے زیادہ مالیہ سرکار کو ادا کرتے تھے۔ ان تینوں نشستوں کو اس طرح ڈھالا گیا کہ ان میں سے ایک مسلمانوں کے حصّے میں آئی۔ ایک ہندوؤں کے حصّے اور ایک سکھوں کے حصّے میں۔

ایک نشست یونیورسٹی کو دی گئی۔ ایک صنعت کو اور ایک ایوانِ تجارت کو۔ یونیورسٹی اور صنعت کی نشستیں عام طور پر ہندوؤں کے قبضے میں رہیں۔ اور تجارت کی نشست یورپئیوں کے قبضے میں۔

اس طرح ۷۱۔ انتخابی نشستوں میں سے ۳۴ تو مسلمانوں کو ملیں۔ اور ۳۷ باقی فرقوں کو۔ گویا انتخابی لحاظ سے مسلمان پھر بھی اقلیت میں رہے۔

نامزد نشستیں

انتخابی نشستوں کے علاوہ بائیس یا تیئیس نامزد نشستیں بھی تھیں۔ جن میں دو تہائی کے قریب سرکاری اور ایک تہائی غیر سرکاری ارکان ہوتے تھے۔ غیر سرکاری نشستوں میں بھی مسلمانوں کی اقلیت رہا کرتی تھی۔ اور سرکاری نشستوں میں تو یورپئیوں کو کافی اکثریت حاصل ہو جاتی تھی۔

توازن حاکمہ

۹۴۔ ارکان کی کونسل میں سے تیئیس (۲۳) تو نامزد ارکان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ حکومت

کے فیصلہ کے مطابق رائے دینا تھا۔ باقی میں سے ۴۳ مسلم اور ۲۷ غیر مسلم تھے۔ اس طرح سارے ایوان میں نہ مسلمان کوئی حقیقت رکھتے تھے اور نہ ہندو اور سکھ۔ جب تک ہندو سکھ اور مسلمان متحد نہ ہوں اکثریت رائے حکومت کو حاصل رہتی تھی۔ اس لئے وہ جس طرح چاہے حکمت عملی کو ڈھال سکتی تھی۔ توازنِ حاکمہ حکومت کے نامزد ارکان کے ہاتھ میں تھا۔

محکمہ جات منتقلہ و محفوظہ

حکومت کے محکمے دو حصّوں میں تقسیم کئے گئے تھے منتقلہ اور محفوظہ۔ منتقلہ محکموں کا چارج دو وزیروں کے ہاتھ میں تھا جن کو منتخب شدہ ارکان میں سے گورنر نامزد کرتا تھا۔ محفوظہ محکمے مجلس انتظامیہ کے دو ارکان کے ہاتھوں میں تھے۔

دو وزیر

پہلے دو وزیروں میں سے ایک میاں فضل حسین صاحب مرحوم تھے جو بعد میں "سر" بنائے گئے۔ دوسرے وزیر لالہ ہرکشن لال صاحب آنجہانی تھے جن کی زندگی نشیب و فرازِ عالم کی ایک جانگزا داستان ہے۔

میاں فضل حسین صاحب کو تعلیم اور بلدیات وغیرہ کا کام سونپا گیا یہاں اس وقت انہیں کی حکمت عملی اور انہیں کے نکتہ چینیوں کا ذکر پیش نظر ہے۔

۱۹۲۱ء کا زمانہ

۱۹۲۱ء میں یہ وزارت پہلی مرتبہ عالم وجود میں آئی۔ اس وقت جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی لیکن دنیا میں ابھی امن و امان قائم نہ ہؤا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں ہولناک حوادثات رونما ہو چکے تھے۔ اور انگریزوں کا قتل۔ جلیانوالہ کا قتلِ عام۔ مارشل لا اور اس کا ساز و سامان پنجاب اور ہندوستان کے دلوں کو ہلا چکا تھا۔ ترکی حکومت پر زوال طاری تھا۔

عرب کے علاقے یورپین حکومتوں کے زیر اثر آچکے تھے۔ ترکی کا دیرینہ مریض آخری ہچکیاں لے کر ایک مرتبہ پھر بستر مرگ سے اُٹھنے کے لئے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی لہر دوڑ رہی تھی۔ کانگرس اور خلافت کا ہر طرف چرچا تھا۔ خلافت کی بحالی اور سوراج کے حصول کے لئے جدوجہد جاری تھی۔

کانگرس اور خلافت نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ جن لوگوں نے بائیکاٹ کی خلاف ورزی کی۔ وہ کونسلوں کے ممبر اور وزیر بن کر امور سلطنت کو سرانجام دینے لگے۔

میاں سر فضل حسین کی حکمت عملی

یہ زمانہ تھا جس میں میاں سر فضل حسین اپنی کارگزاری دکھانے لگے۔ انہوں نے اپنے محکمہ جات میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی شروع کی۔ اس عہد کی چند ایک باتیں زیادہ موضوع بحث رہی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ کالج اور میڈیکل کالج لاہور میں چالیس فی صدی مسلمان طالب علموں کو داخل کرنے کا حکم، محکمہ تعلیم میں چالیس فی صدی ملازمتیں مسلمانوں کو دئے جانے کا سرکلر، چند میونسپل کمیٹیوں میں جداگانہ انتخاب اور میونسپل کمیٹیوں میں آبادی اور تعداد رائے دہندگان کے اوسط کو انتخابی تناسب کی بنیاد قرار دینے کا فیصلہ، پنچایت ایکٹ کا نفاذ۔

ان معاملات میں میاں سر فضل حسین کے فیصلوں کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں نے بڑی شدّت سے پروپیگنڈا شروع کیا۔ برسوں ایسا شور و غوغا ہؤا کہ اس میں کانگرس اور خلافت کی تحریکیں بے اثر ہو کر رہ گئیں۔ جس قدر مخالفت ہندوؤں نے کی اسی قدر میاں سر فضل حسین مسلمانوں میں مقبول و محبوب ہوئے۔

میاں سر فضل حسین اور پروفیسر گلشن رائے

اس مرحلہ پر مجھے ایک جملہ معترضہ ضرور عرض کرنا ہے۔ وزارت کا کام سنبھالنے سے

پہلے میاں سر فضل حسین لاہور میں وکالت کرتے تھے۔ پروفیسر گلشن رائے صاحب ان کے ساتھ بطور جونیئر وکیل کے تھے۔ اسی طرح میاں فضل حسین اور پروفیسر گلشن رائے دونوں ایک ہی میز پر بیٹھ کر کام کرنے والے اور ایک دوسرے کی فلاح و بہبود کی تدبیر کرنے والے تھے جب میاں صاحب وزیر ہو گئے۔ اور اپنی حکمت عملی پر کاربند ہونے لگے تو ان کی حکمت عملی کے سب سے زیادہ واقف اور اس پر سب سے زیادہ تیزی سے حملہ کرنے والے یہی پروفیسر گلشن رائے تھے۔ ان کی ہمیشہ یہی رائے رہی ہے اور آج تک ہے۔ کہ میاں فضل حسین بہت بڑے قوم پرست تھے۔ میاں فضل حسین کی شہرت کو سیاسیات کے میدان میں چار چاند لگانے کا سہرا پروفیسر گلشن رائے کے سر ہے۔ سینئر اور جونیئر وکیلوں نے پنجاب کے مباحث کو خوب رونق دی۔

جداگانہ انتخاب کا جھگڑا اور مسلم راج کا غل

میاں فضل حسین نے جو کچھ کیا اس پر بحث کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ کیا جو کچھ وہ کر رہے تھے اس کے لئے فقط وہی ذمہ دار تھے یقیناً وہ خود اور ان کے مسلمان ساتھی اپنی مرضی اور رائے سے کوئی حکمت عملی چلا نہ سکتے تھے۔ ان کی ہر کارروائی کا مدار حکومت کے برطانوی ارکان کی رائے پر تھا۔ اگر گورنر اور اس کے ماتحت سرکاری افسر میاں صاحب کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوتے۔ تو وہ بذات خود ایسے کام کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ مجھے اس بات کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے اس وقت بڑے زور و شور سے یہ پروپیگنڈا کیا کہ پنجاب میں مسلم راج قائم ہو گیا ہے۔ اور یہ سب مُسلم راج کی برکتیں ہیں۔ جو ہندوؤں اور سکھوں پر نازل ہو رہی ہیں۔ انہوں نے میاں فضل حسین کی حکمت عملی کے لئے مسلم راج کو

ذمہ وار قرار دیا حالانکہ اس کی ساری ذمہ واری برطانوی عنصر پر تھی۔ میاں فضل حسین کو اپنی کارگزاریوں کی ضرورت سے زیادہ داد ملی۔ اور اس کے لئے پروفیسر گلشن رائے کے خصوصاً اور باقی ہندوؤں اور سکھوں کے عموماً شکر گزار ہوتے تو کوئی اچنبھا نہ تھا۔

عام ہندوؤں نے پنجاب میں مسلم راج کا غل مچانا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی اس کارروائی کی ساری ذمہ واری جداگانہ انتخاب پر ڈالی۔ کانگرسی اور غیر کانگرسی احباب نے جداگانہ انتخاب کو ہر مصیبت کا باعث قرار دیا۔ جو فسادات ملک میں رونما ہوئے ان کو بھی جداگانہ انتخاب کا ہی نتیجہ بتایا گیا۔

قوم پرستی کیا ہے؟

اب ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ قوم پرستی کیا ہے؟ جس وقت گورنمنٹ کالج اور میڈیکل کالج میں ۴۰ فی صدی مسلم طلبہ کے داخلے کا حکم دیا گیا۔ اس وقت بھی یہی شور ہوا کہ یہ فرقہ پرستی ہے۔ یہ قوم پرستی کے منافی ہے۔ جب یہ شور اٹھے تو ضرور غور کرنا پڑتا ہے کہ آخر ہو کیا گیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس حکم سے کسی نہ کسی ہندو طالب علم کو گورنمنٹ کالج یا میڈیکل کالج میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ مگر ہمارے قوم پرست احباب کو یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ اگر یہ حکم دے دیا کہ چالیس فی صدی مسلمان طالب علم داخل کئے جائیں تو یہ تو فرقہ پرستی ہے۔ لیکن اگر نوے فی صدی یا سو فی صدی ہندو طالب کسی ایسے قاعدے یا قانون کے بغیر داخل کر لئے جائیں جو ان کو اسی تعداد میں داخل کرنے کا حکم دیتا ہو تو کیا یہ عین قوم پرستی ہے؟

مسلمانوں کو چالیس فی صدی تعلیمی نشستیں دینے کی ضرورت آخر کیوں پڑی؟ کیا اسی لئے نہیں کہ اس حکم سے پہلے مسلمانوں کو اس تعداد میں بھی داخل نہ کیا جاتا تھا۔ کیا قوم پرستی

یہی ہے۔ کہ بلا روک ٹوک سب کے سب ہندو داخل کرلئے جائیں؟

جو شخص چالیس فی صدی جگہیں مسلمانوں کے لئے مخصوص کرنے پر اعتراض کرتا ہے اسے یہ بھی سوچنا چاہئے کہ وہ ساٹھ فی صدی سے بھی زیادہ اپنے لئے چاہتا ہے اگر اس کی قوم پرستی ساٹھ فی صدی سے زیادہ چاہتی ہے تو وہ قابل ملامت ہے یا مسلمان کا چالیس فیصدی طلب کرنا؟

یہی حال محکمہ تعلیم کی چالیس فی صدی ملازمتوں کا سمجھئے۔ اسی قسم کا تبصرہ اور کئی امور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایک عجیب معمّہ

اس صورت حال کا تذکرہ مختصراً کرنے کے لئے میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس زمانے میں پیش آیا۔ ۱۹۲۳ء میں جب ہم لوگ جیل کاٹ کر باہر آئے۔ تو زبان و قلم پر یہ نیا شور و غل جاری تھا۔ میاں فضل حسین کی پالیسی موضوع بحث تھی۔ ہمارے ساتھی ہندو کانگرسی لیڈروں نے ان معاملات پر ہم سے تبادلۂ خیالات کیا۔ اور چاہا کہ ہم میاں فضل حسین کے خلاف بیان شائع کریں۔ کہ انہوں نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ وہ قوم پرستی کے خلاف ہے۔ بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر ہمیں دریافت کرنا پڑا کہ جس سوراج کے لئے ہم نے قربانیاں کی ہیں۔ اور آئندہ قربانیاں کرینگے۔ اس میں ہمیں چالیس فی صدی حصہ ملازمتوں میں ملے گا یا نہیں؟ اور میونسپل کمیٹیوں وغیرہ میں بھی کچھ ہماری حیثیت قائم رہ سکے گی یا نہیں؟

ہمیں فوری اور مختصر جواب ملا کہ "ہاں سوراج میں تو نوکریاں اس سے بھی زیادہ ملیں گی اور زیادہ حقوق ہونگے۔ آپ یہی اعلان کردیں کہ سوراج میں تو مسلمانوں کو ملازمتوں وغیرہ

میں زیادہ حصّہ ملے گا۔ مگر اس وقت جو کچھ میاں فضل حسین نے کیا ہے۔ وہ قوم پرستی کے خلاف ہے۔

ہمیں ان ارشادات کا یہی جواب دینا پڑا کہ دنیا ہمیں کیا کہے گی کہ جب سوراج ملے گا تو یہ سب کچھ جائز ہو گا۔ لیکن اگر فضل حسین کرے۔ تو وہ خطا کار رہے۔ آخر ہم دنیا کے سامنے کونسا مُنہ لے کر جائیں؟

ہمارے دوست تو میاں فضل حسین کے ساتھ ہماری قوم پرستی سے بھی مایوس ہوئے اور ناچار محفل کو برخاست کرنا پڑا۔ کیونکہ پوزیشن ایک عجیب معمّہ سا بن رہی تھی۔

نئی جدوجہد

یثاق لکھنؤ کی اساس پر قائم کیا ہوا دستور اساسی ابھی تین برس بھی نہیں کاٹ چکا تھا کہ اس پر شدت سے حملہ شروع ہوا۔ اس حملہ کی بنا جداگانہ انتخاب کی مخالفت تھی۔ مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ جداگانہ انتخاب کے خلاف اس قدر شور و غل برپا کیوں ہوا۔ اور پنجاب میں مسلم راج کا غوغا کیوں بلند کیا گیا۔

پہلا سبب

اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں جس کے ذریعے وہ آئین اساسی نافذ کیا گیا تھا، دس برس کے اندر اندر یا دس برس کے بعد ضرور ترمیم ہونا تھی۔ اس لئے اس پر حملہ کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ اس میں حسب منشا تبدیلی کرائی جا سکے۔

دوسرا سبب

دوسرا سبب یہ تھا۔ کہ دنیا کے عام دستور کے مطابق جس کسی کے ہاتھ میں قوت، اقتدار

یا دولت آجائے۔ وہ رضامندی سے اسے اپنے ہاتھ سے گنوانا یا اس میں اپنے سے کسی کمزور کو حصّہ دار بنانا گوارا نہیں کرتا۔ جن قوموں کو دنیا میں استعماری حیثیت حاصل ہو چکی ہے وہ برضا و رغبت اپنی حیثیت کو زائل کرنے پر مائل نہیں ہوتیں۔ فرانس کبھی مراکش۔ الجیریا یا طونس کو چھوڑنے کا خواہش مند نہیں۔ بالشویک روس بھی تاتاری اور ترکستانی علاقوں کو اسی طرح زیر نگیں رکھنے کا خواہش مند ہے جس طرح زار کا روس تھا۔ اطالیہ اپنے لئے کارسیکا اور نیس کے علاقے نسلی بنا پر طلب کرتا ہے۔ مگر وہ طرابلس کو عربوں کے سپرد کرنے پر آمادہ نہیں۔ برطانیہ ہندوستان کو طفل تسلیاں دے سکتا ہے اور آزادی کے نام پر لڑ سکتا ہے مگر وہ آزادی کی پوجا کرتے ہوئے اپنی استعماری قوت کا زوال قبول نہیں کرتا۔ وہ ہندوستان کو آزادی کامل کی نعمت سے مالامال کرنے کا خواہش مند نہیں۔

جس طرح برطانوی حکومت اور انگریزی قوم نے ہندوستان میں ہر مرحلہ پر کچھ اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کرنے سے پہلے اپنے موجودہ اختیارات کو سنبھالے رکھنے کی بجد کوشش کی ہے۔ اسی طرح برطانوی حکومت کے زیر سایہ تاریخی وجوہات کے باعث ہندوؤں کو ہندوستان میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہر جگہ ایک فائق حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مسلمانوں نے ابتدا میں انگریزی حکومت سے تعاون کرنا یا اس کی ملازمت میں حصّہ لینا قومی گناہ قرار دیا۔ اس لئے وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت سے خارج رہے۔

علاوہ بریں خود حکومت انگریزی نے ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد میں مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے اپنا قوی ترین رقیب سمجھا۔ اور ان کو نیچا دکھانے ان کی قوت کو توڑنے اور ان کی آئندہ سازشوں سے بچنے کے لئے اس کو پیچھے پھینکنا پسند کیا۔ اکثر ہندوؤں نے بھی مصلحت وقت کی بنا پر انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسانا اور خود ان کی سرپرستی حاصل کرنا اپنا وتیرہ بنایا۔

۱۹۲۱ء میں ہندوؤں کی دُہری غلط فہمی

جس وقت ۱۹۲۱ء میں اور اس کے بعد ہندوؤں نے پنجاب اور اس کے باہر جداگانہ انتخاب کی مخالفت شروع کی۔ اور مسلمانوں کو ملازمتوں وغیرہ میں محدود مگر محفوظ حصہ دئے جانے پر شور مچایا۔ اس وقت وہ دہری غلطی میں مبتلا رہے۔

پہلی غلطی!

پہلی غلطی تو یہ تھی۔ کہ انہوں نے سوراج اور آزادی کے الفاظ کو تو استعمال کیا مگر وہ سوراج اور آزادی کے خوش آیند دور میں اپنی ذمہ واریوں کا احساس بھی نہ کر سکے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قفس میں رہنے والے پرندے کی طرح انہوں نے بیرون قفس زندگی بسر کرنے کو کچھ ایسی کراہت سے دیکھا۔ کہ وہ صاحب قفس کے بغیر جینے کے تصوّر سے ہی دل برداشتہ سے رہے۔

اگر انہیں یہ احساس ہوتا کہ ہندوستان آزاد ہو سکتا ہے۔ اور اس میں انگریزوں کے بغیر زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ تو شاید ان کا رویہ دانش مندانہ ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ ہندوستان کی سیاست میں اپنے فائق درجے کا احساس کرتے اور دوسرے فرقوں کے ساتھ شایانِ شان سلوک کرنے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ مگر ان کو تو یہی سودا سمایا تھا۔ کہ دس برس کے اندر اندر آئین اساسی میں تبدیلی ہو گی۔ ہمیں اس تبدیلی کے وقت برطانوی حکومت پر پورا دباؤ ڈالنا ہے۔ اپنی تقریر و تحریر کے بل بوتے اپنے وفدوں اور جلسوں کے زور سے حکومت سے اپنی بات منوا کر مسلمانوں کو نیچا دکھانا ہے۔

دوسری غلطی!

دوسری غلطی جس میں ہمارے بھائی مبتلا تھے، یہ تھی کہ جس طرح اپنے ابتدائی ایام میں حکومت برطانیہ نے ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دی تھی اسی طرح وہ اب بھی بہرحال

ترجیح دیگی۔ اور مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں سر اٹھانے نہ دیگی۔ مگر تین پشتوں کے بعد حالات ویسے نہ تھے جیسے ۱۸۵۷ء کے بعد ہو گئے تھے۔

اس عرصے میں ہندو قوت تمام ہندوستان میں منظم ہو رہی تھی۔ مال و دولت کی فراوانی تعلیم کی ترقی، ملازمت پر قبضہ اسے حاصل تھا۔ جو پوزیشن ۱۸۵۷ء میں یا اس سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کو حاصل تھی وہ اب ہندوؤں کو حاصل ہو چکی تھی۔ پہلے تو مسلمان برطانوی قوت کے بدترین یا بہترین رقیب تھے۔ اب مسلمان قوت تباہ حال تھی اور ان کی جگہ ہندو برطانوی قوت کے بدترین یا بہترین رقیب بن چکے تھے۔

مسلم لیگ کے قیام پر اعتراضات

ہندوؤں کے رہنماؤں کو بخوبی علم تھا۔ اور وہ ہمیشہ کہتے چلے آئے ہیں کہ حکومت نے کانگرس کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلے میں مسلم لیگ کو کھڑا کیا۔ اگر یہ بات درست تھی۔ تو ہندوؤں کو سمجھنا چاہئے تھا کہ برطانوی ہند میں اب توازنِ قوت کے پلڑے کا جھکاؤ پہلو بدل رہا ہے پچاس برس تک مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور ہندوؤں کو ان کے مقابلے میں بڑھانے کی ضرورت تھی۔ پچاس برس کے بعد وہ ضرورت ضرورت سے زیادہ پوری ہو چکی تھی۔ اس لئے اب پرانی حکمت عملی کو بدلا جا رہا تھا۔

ہندوؤں کی تعلیمی۔ تجارتی۔ اقتصادی اور سیاسی ترقی کے مقابلہ میں پسماندہ مسلمانوں کو کھڑا کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر ہندو رہنما اس حقیقت کا حقیقی احساس کرتے اور مسلمانوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ہر مناسب قربانی کو تیار ہوتے تو ہندو مسلم مسئلہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت کا روپ نہ دھار لیتا۔

قومی تحریک کو دھکا

میثاق لکھنؤ کی مخالفت اور پنجاب میں مسلم راج کے شور و غل سے ہندو مسلم تعلقات

میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ اتحاد کی وہ دیوار جو جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کی ہڈیوں سے چنی گئی تھی، پنجاب کونسل کی کارروائیوں کی بدولت شگاف خوردہ ہو گئی۔ جس حکومت کے خلاف ہندو اور مسلمان متحد ہوئے تھے اور جس سے مسلمانوں کے لئے عرب کے مقدس مقامات اور خلافت اسلامیہ کی آزادی وبحالی کا مطالبہ کر رہے تھے جس حکومت سے مظالم پنجاب کی تلافی اور ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ وہ حکومت اور اس کی حمایت کا دم بھرنے والے اپنی حفاظت سے غافل نہ ہو سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ مہاتما گاندھی اور ان کے پیرو ہندو، مسلمانوں کے ساتھ مل کر خلافت کا راگ الاپ رہے ہیں۔ اور علی برادران اور ابوالکلام آزاد مسلمانوں کو ساتھ لے کر سوراج کے حصول کی جدوجہد میں ہندوؤں کے کھوے سے کھوا ملا رہے ہیں۔ انہوں نے جوابی کارروائی کی تدبیر سوچی اور پنجاب کی وزارت تعلیم کو مسلمانوں کو چالیس فی صدی ملازمتیں یا چالیس فی صدی داخلہ کے حقوق دلوانے کا فیصلہ کیا۔

پنجاب کونسل میں مسلمان وہ تھے جو خلافت کی عالی شان اور عالمگیر تحریک سے اختلاف کر کے کونسلوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہندو وہ تھے جو سوراج اور مظالم پنجاب کو پس پشت ڈال کر کونسل میں جا دھمکے تھے۔ ان دونوں کو ضرورت تھی۔ کہ قومی تحریک سے مخالفت کرنے کی آنے والی سزا سے بچیں۔ اور اس مقصد کے پیش نظر قومی تحریک کی بنیادوں ہی کو متزلزل کر دیں۔

سر فضل حسین نے ۴۰ فی صدی کا راگ الاپا۔ راجہ نرندر ناتھ اور ان کے ہم نواؤں نے پنچم کے سروں میں ہندو حقوق کی حفاظت کے گیت گائے۔ مسلمانوں کو سمجھایا جانے لگا۔ کہ جو ہندو پنجاب میں مسلمان کو چالیس فی صدی حصہ ملازمتوں میں یا کالجوں کے طالب علموں

میں نہیں دے سکتا۔ وہ خلافت کا حامی اور مقاماتِ مقدسہ کا محافظ کب ہو سکتا ہے۔ وہ تو مسلمانوں کو انگریزوں سے ٹکرانے کے لئے فریب کر رہا ہے۔ ہندوؤں سے یہ کہا گیا کہ جس مسلمان کو ساتھ لے کر آزادی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ وہ تو فضل حسین بن کر تمہاری آج کی ملازمتوں کو بھی چھین رہا ہے۔ اور تمہارے بچوں پر کالجوں کے دروازے بند کر رہا ہے۔ جب آزادی آ ہی جائے گی پھر کیا کچھ نہ ہو گا؟

پنجاب کی سیاست کا بگڑتا ہوا کھیل سارے ہندوستان پر اثر انداز ہوا۔ اتحاد کی عمارت میں شگاف ہونے لگے۔ اور دوستی و مودت کا سلسلہ اجنبیت اور عداوت کا رنگ پکڑنے لگا۔

ہندوؤں نے یہ نہ سوچا۔ کہ اگر فضل حسین نے کچھ ملازمتیں وغیرہ مسلمانوں کو دلا دی ہیں۔ تو اس نے کوئی غضب نہیں ڈھایا۔ اور ہندوؤں کو ناقابلِ برداشت چرکا نہیں لگایا مسلمانوں نے یہ نہ سوچا کہ جو لوگ مقاماتِ مقدسہ اور خلافتِ اسلامیہ کی حفاظت میں سینہ سپر نہیں ہو سکتے۔ وہ چالیس فی صدی ملازمتوں وغیرہ سے اسلامیانِ ہند اور اسلامیانِ عالم کی کیا کچھ خدمت کریں گے۔

جُداگانہ اور مخلوط انتخاب

۱۹۲۴ء میں کانگرس کے بڑے بڑے رہنما لاہور میں آئے۔ ان دنوں یہاں سر فضل حسین کی چیرہ دستیوں کی داستانیں ہندوؤں کی زبان پر تھیں۔ کانگرس کے ہندو رہنماؤں کے سامنے سب رونا رو دیا گیا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی۔ آر داس جیسے بزرگوں نے ہندوؤں کی داستانِ غم سنی۔ اور میاں (سر) فضل حسین سے مل کر حالات کا جائزہ لینے کا وعدہ کیا۔

میاں سر فضل حسین کی تکمیلِ مثل

یہاں (سر) فضل حسین کے دروازے ہر جویائے حال کے لئے کھلے تھے۔ انہوں نے مسٹر داس اور پنڈت نہرو جیسی گرانقدر ہستیوں کے سامنے سارا معاملہ کھول کر پیش کر دیا۔ اور جو کچھ کیا تھا اس کی مکمّل جواب دہی کر دی۔ جب یہ بزرگ وہاں سے واپس آئے۔ اور ہندوؤں نے ان سے رائے طلب کی۔ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ "میاں فضل حسین نے اپنی مثل خوب مکمّل کی ہے"

پنجاب کے ہندو لیڈر تو خواہاں تھے۔ کہ مسٹر سی۔ آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو ان کے حق میں اور میاں فضل حسین کے خلاف کوئی بیان دیتے۔ مگر ان کا بیان میاں فضل حسین کے خلاف نہ جا سکتا تھا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا۔ کہ کوئی بیان نہ دیا جائے اس طرح ملازمتوں وغیرہ کا قصہ بھی چلتا رہا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جداگانہ انتخاب پر حملہ ہونے لگا۔

فسادات پنجاب و ہند

ستمبر ۱۹۲۲ء میں ملتان سے شروع ہو کر کئی شہروں اور دیہات میں فسادات ہو چکے تھے اگرچہ اس سے پہلے دوسرے صوبوں میں بھی فسادات کا ظہور ہو چکا تھا لیکن ملتان کے فساد کے بعد پنجاب اور شمالی ہند کی فضا بھی بہت بگڑ گئی۔ چونکہ یہاں کے ہندو جداگانہ انتخاب کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے سب فسادات کی ذمہ داری جداگانہ انتخاب کے سر ڈالی۔ یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ تھا۔ جو ہندو کے دل و دماغ پر اثر کرتا تھا۔ اگرچہ دانا لوگ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے فسادات کے وقوع سے اسی طرح ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے جس طرح گرامی مرحوم کا ملازم قرب مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھایا کرتا تھا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے جھگڑے کے آئندہ دور کا تذکرہ کروں، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے متعلق چند ایک حقائق قارئین کرام کے گوش گزار کر دوں۔

کیا مخلوط انتخاب فسادات کو ختم کر دیتا ہے

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ کیا مخلوط انتخاب کے بعد فسادات کا خاتمہ ہو جاتا

ہے؟ کیا ہندوستان اور باقی دنیا کی تاریخ ہمیں کوئی ایسا سبق دیتی ہے؟ جن میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مخلوط انتخاب رائج رہا ہے۔ کیا وہاں فسادات کبھی نہیں ہوئے۔ ہندوستانی دیہات بالخصوص پنجابی دیہات کے سب فسادات ایسے علاقوں میں ہوئے جہاں ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخاب مخلوط رہے ہیں۔ کیا دیہات میں ہولناک فسادات نہیں ہوئے۔

ہندوستان کو جانے دو۔ یورپ کی مثالیں سامنے رکھو۔ کیا ہسپانیہ کی دو برس کی گزشتہ خانہ جنگی جس میں لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے دانستہ قتل کئے گئے ہسپانیہ کے مخلوط انتخاب کا ناگوار نتیجہ نہ تھی۔ کیا وہاں کوئی جداگانہ انتخاب تھا جس نے ملک کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

کیا روس میں زار کے زمانے میں جداگانہ انتخاب کا رواج تھا۔ کیا روس میں امیر اور غریب کی جنگ جداگانہ انتخاب کی پیداوار تھی؟ نہیں نہیں وہاں جب بھی انتخاب آیا مخلوط آیا۔ پھر بھی مخلوط انتخاب ملک کو عالمگیر فتنہ وفساد کے شعلوں کی لپیٹ سے نہ بچا سکا۔

کیا چیکوسلواکیہ میں مخلوط نہ تھا۔ پھر کیا جرمن اور چیک آبادیاں مخلوط انتخاب کے باعث امن میں رہ سکیں۔

کیا پولینڈ میں مخلوط انتخاب نہ تھا۔ پھر کیا جرمن، سفید روسی، یوکرینی اور لتھونوی اقلیتیں مطمئن اور پرامن زندگی گزار سکیں۔

رومانیہ اور جوگوسلاویہ کے مخلوط انتخاب نے کیا کیا رنگ نہیں دکھائے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ کہ مخلوط انتخاب دنیا کو فساد سے نہیں بچا سکا۔ اس لئے محض مخلوط انتخاب کو امن کا ضامن قرار دینا اور ہر فساد کی ذمہ داری جداگانہ انتخاب پر

ڈالنا ایک غلط رویّہ ہے جس کو دانستہ اختیار کیا گیا ہے۔

مُسلمان کا جُداگانہ انتخاب

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قصور وار مُسلمان جُداگانہ انتخاب کی طرف کیوں جھکتا ہے۔ اور قصور سے بالاتر ہندو جُداگانہ انتخاب کو گالیاں کیوں دیتا ہے۔

مسلمان کا جُداگانہ انتخاب خود غرضی پر مبنی ہے۔ مگر یہ خود غرضی کیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مخلوط انتخاب میں ہندو کا زر و مال۔ اس کی زمینیں اور مکانات۔ اس کے کارخانے اور سرکاری ملازمت کے اثرات مسلمان کے خلاف کام کرینگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک عرصہ تک مالک مکان اپنے کرایہ دار کو اپنی مرضی کے مطابق رائے دینے پر مائل یا مجبور کر سکتا ہے۔ مالک اراضی اپنے کاشتکار کو اپنی راہ چلانے پر مائل یا مجبور کر سکتا ہے۔ اسی طرح کارخانے کا مالک اپنے مزدوروں کو، سرکاری ملازم اپنے ماتحتوں اور زیر اثر لوگوں کو، اور روپیہ پیسہ خرچ کر سکنے والا انسان اپنے روپے پیسے سے غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق رائے دینے پر مائل یا مجبور کر سکتا ہے۔ ان چیزوں کا کیا کہنا، وہ لوگ جن کو عرفِ عام میں غنڈے اور بدمعاش کہا جاتا ہے، کمزور شرفا کو اپنی مرضی کے خلاف رائے دینے نہیں دیتے اور خود بھی خریدے جا سکتے ہیں۔ چونکہ مسلمان ان معاملات میں ہندوؤں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کا رجحان اس طرف رہا ہے۔ کہ وہ جُداگانہ انتخاب کو قبول کریں۔ اور مخلوط انتخاب سے کتراتے رہیں۔ وہ اپنے حقوق کو ہندوؤں سے بچانے کے لئے جداگانہ انتخاب پر زور دیتے رہے ہیں۔ ان کے رویّہ کو نامعقول نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے میں یہی کہوں گا کہ بے شک مسلمانوں نے اپنی خود غرضی سے اپنے حقوق کو بچانے کے لئے جُداگانہ انتخاب کی عموماً تائید کی ہے۔

ہندوؤں کا مخلوط انتخاب

مگر ہندوؤں کا مخلوط انتخاب کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ مخلوط انتخاب کی آواز کیوں بلند

کرتے ہیں۔ کیا وہ اپنے حقوق کو بچانے کے لئے مخلوط انتخاب کا دم بھرتے ہیں؟

میرا نظریہ یہ نہیں ہے۔ اور گو میرے برادرانِ وطن بہت ناراض ہوں۔ اور مجھے پانی پی پی کر کوسیں۔ مگر میں ان کو خوش کرنے کے لئے غلط باتیں نہیں کہوں گا۔ کیونکہ جب تک تلخ حقیقت کا جام نہ پیا جائے۔ خوشگوار نتائج کی توقع نہیں ہو سکتی۔

جب ہندو مخلوط انتخاب کی آواز بلند کرتا ہے۔ تو وہ اپنے حق کی حفاظت کے لئے نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے دبائے ہوئے حقوق کو دبائے رکھنے یا نہ دبائے ہوئے حقوق کو دبا سکنے کی خاطر۔

کیا سر فضل حسین نے پنجاب میں مسلمانوں کو ان کے حق سے کچھ زیادہ دے دیا تھا؟ کوئی ہندو نہیں کہہ سکتا کہ ہاں۔ مگر پھر بھی اُنہوں نے آسمان سر پر اُٹھایا۔ کہ ہندوؤں پر ظلم ہو گیا ہے۔ پنجاب میں ۵۶ فی صدی ہونے کے باوجود اکثر ملازمتوں میں وہ ۴۰ فی صدی بھی نہیں تھے۔ اس لئے سر فضل حسین کو ۴۰ فی صدی کا سرکلر جاری کرنا پڑا۔ بجائے اس کے کہ ہندو اس سرکلر پر خوشی کا اظہار کرتے، اور جس طرح کلکتہ میں مسٹر سی۔ آر داس نے ۶۰ فی صدی ملازمتیں مسلمانوں کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ تاکہ گذشتہ کمی کو پورا کیا جا سکے۔ اسی طرح پنجاب میں سر فضل حسین کی کارروائی کو برداشت کرتے اور بے سود اور پُر شر پراپیگنڈا سے باز رہتے انہوں نے ہندو مسلم فساد کا ایک وسیع دروازہ وا کر دیا۔ جس پر شیخ سعدی کا یہ ارشاد بالکل صادق آتا ہے۔ کہ ؎

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل ✣ چو پُر شد نشاید گذشتن بہ پیل

یعنی چشمہ کا مُنہ سُرمہ کی سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ بھر جائے تو ہاتھی بھی اس میں سے نہیں گزر سکتا۔

چالیس فی صدی ملازمتوں اور داخلوں وغیرہ پر واویلا کرنے والے آج "پاکستان" کے خلاف اودھم مچا رہے ہیں۔ اگر بیس برس پہلے ہوش سے کام لیا ہوتا تو آج یہ محشر برپا نہ ہوتا۔

اگر ہندوؤں نے پنجاب میں مخلوط انتخاب کی آواز اُٹھائی۔ تو وہ کس بنا پر تھی۔ کیا وہ مسلمانوں کو اپنی گرہ سے کچھ دینا چاہتے تھے؟ ان کو تو یہ خیال تھا کہ جداگانہ انتخاب سے چُنے ہوئے مسلمانوں کی امداد کی بدولت سر فضل حسین اس قسم کے سرکلر اور احکام جاری کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ اگر انتخاب مخلوط ہوگا۔ تو مسلمان ممبر اور وزیر ہندو ووٹروں کے محتاج بھی ہونگے۔ اس لئے وہ ہندوؤں کو ناراض کر کے ایسے احکام جاری کرنے کا حوصلہ نہ کرینگے۔ کیونکہ ان کو آئندہ انتخاب کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہے گی۔

ہندوستان کا جھگڑا بالعموم پنجاب کا جھگڑا کہلایا ہے۔ پنجاب کو ہی ہندوستان کا السٹر (ULSTER) کہا گیا ہے۔ پنجاب کا آئینی فارمولا ہی ہمیشہ باعثِ نزاع رہا ہے۔ پنجاب سے ہی جُداگانہ انتخاب پر کاری حربہ لگانے کی شدید ترین کوشش کی گئی ہے۔ اور سارے ہندوستان کے مفاد کو خطرے میں ڈالا گیا ہے۔ اس لئے مخلوط انتخاب کے حق میں اور جداگانہ انتخاب کے خلاف یہ کہنا کہ مخلوط انتخاب سے متحدہ قومیت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اور جُداگانہ انتخاب سے کمزور تاریخی طور پر ایک غلط نظریہ ہے۔ اگر پنجاب میں جداگانہ انتخاب کے خلاف آواز اُٹھی تو وہ اس لئے اُٹھی کہ مسلمانوں کو ملازمتوں۔ داخلوں اور میونسپل کمیٹیوں وغیرہ میں تھوڑے سے حقوق بھی کیوں دئے جا رہے ہیں۔

فائق اقتدار کا جھگڑا

جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا جس شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ وہ متحدہ قومیت کا جھگڑا نہیں۔ وہ فائق اقتدار کا جھگڑا ہے۔ ہندوؤں کو انگریزی عملداری کے ابتدائی دَور میں جو حد اور حق سے زیادہ حصہ مال و دولت، تعلیم و ملازمت، صنعت و تجارت میں ہاتھ آیا۔ اور انہیں مسلمانوں پر جو فائق اقتدار حاصل ہُوا۔ وہ اس کو چھوڑنے پر آسانی سے

تیار نہیں ہو سکے۔ اُنہوں نے صوبجاتی معاملات ہیں کوتاہ اندیشی سے کام لے کر تمام ہندوستان میں جھگڑے کی بُنیاد کو وسیع کیا۔ اور آج اس فصل کے کانٹے ہر آنکھ اور ہر دل میں چُبھ رہے ہیں جو سر فضل حسین کی وزارت کے دَور میں بوئی گئی تھی۔

ہندو ہر حال میں مخلوط انتخاب کے حامی نہیں

مخلوط انتخاب کے لئے ہندوؤں نے بہت کچھ شور وغل مچایا ہے۔ اگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مخلوط انتخاب کے کسی فارمولا کو بھی آسانی سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اور جہاں کہیں ان کو مخلوط انتخاب تکلیف دہ معلوم ہؤا۔ اُنہوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس مضمون پر مجھے کچھ تفصیل کرنا ہے۔ اس لئے مَیں ایک یا زیادہ مستقل مضامین میں اس پر عرض خیال کروں گا۔ اس وقت مجھے فقط اس حقیقت کا ذکر کرنا تھا اور بس۔

مخلوط انتخاب اور جُداگانہ انتخاب کا فرق

یہ امر بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جُداگانہ اور مخلوط انتخاب میں فی الحقیقت فرق کس قدر ہے۔ گذشتہ عام انتخابات میں جو ۱۹۳۷ء کے اوائل میں ہوئے۔ انتخابات جُداگانہ تھے۔ کانگرس نے اس جُداگانہ انتخاب میں حصہ لیا۔ اور چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کی۔

جو امیدوار کانگرس نے ہندو نشستوں کے لئے کھڑے کئے۔ کیا وہی اُمیدوار اس وقت کھڑے نہ ہوتے جب مخلوط انتخاب ہوتا۔ کیا پنڈت پنتھ کی جگہ یو۔ پی میں اور مسٹر راجگوپال اچاریہ کی جگہ مدراس میں کسی اَور نے کھڑا ہونا تھا۔ کیا وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی نہ تھے۔ کیا ان کے خلاف ہندوؤں کی اور پارٹیاں یا افراد کوشش نہ کر سکتے تھے۔ یا انہوں نے کوششیں نہ کیں۔ کیا کانگرس نے ہندو مہا سبھا سے بھی ٹکر نہ لی۔ کیا ان سب حالات کے باوجود کانگرس نے چھ صوبوں میں جن میں ہندو اکثریت ہے کامیابی حاصل نہیں کی؟

کیا جُداگانہ انتخاب میں ہندو کانگرسی آزادی وطن اور ہندو مسلم اتحاد کے نام پر ووٹ لیکر کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر مخلوط انتخاب ہوتا تو کچھ زیادہ فرق نہ پڑتا۔

صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے ساتھی جُداگانہ انتخاب میں کانگرس ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ باقی صوبوں میں کانگرس مسلمانوں میں کامیاب نہ ہو سکی۔

صوبہ سرحد اور دوسرے صوبوں کا فرق

صوبہ سرحد میں کانگرس کیوں زیادہ کام کر سکی۔ پنجاب اور بنگال میں آج تک وہی صورتِ حال کیوں نہ پیدا ہوئی۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ صوبہ سرحد میں کام زیادہ ہوا۔ اور دوسری جگہ کم۔ بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں مسلمان اپنی غالب اکثریت کے باعث ہندو سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ گو ملازمتوں میں ان کا حصّہ بڑھا ہوا نہ ہو۔ لیکن وہ اس قدر پس افتادہ نہیں جس قدر پنجاب اور بنگال میں ہیں۔ صوبہ سرحد میں ہندو اپنے اقتدار کے لئے زیادہ لڑ نہیں سکتا۔ اور مسلمان کو اپنا اقتدار ہندو سے خطرے میں نظر نہیں آتا۔

پنجاب اور بنگال میں ہندو کو ہندو اقتدار کا اجارہ ٹوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ اور مسلمان اپنا حق سنبھالنے کی فکر میں ہے۔ اس لئے ہندو بھی چیختا ہے۔ کہ مجھ سے کچھ چھنا جا رہا ہے۔ اور مسلمان بھی چلاّتا ہے۔ کہ مجھے جلدی چھیننے کیوں نہیں دیتے۔

سندھ بھی کسی حد تک صوبہ سرحد سے اور کسی حد تک پنجاب اور بنگال سے مشابہ ہے۔ اس لئے وہ آج تک ایک بین بین کیفیت دکھا رہا ہے۔

ہندو اکثریت کے صوبوں کا آپس میں فرق

اسی طرح کی کیفیّت ہندو صوبوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ مدراس۔ سی۔ پی وغیرہ میں جہاں ہندو اکثریت کی نگاہ میں مسلمان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کانگرس کامیاب رہی مگر

صوبہ سرحد۔ سندھ اور پنجاب میں وہ ہندو نشستوں کی اکثریت نہ لے جاسکی۔ بنگال میں اس کو ہندو سبھا کے نظریئے کے سامنے ہتھیار ڈال کر ہی بوس پارٹی کو ساتھ رکھنا پڑا۔ ورنہ وہاں سے صاف جواب مل رہا تھا۔

اس لئے ہندوستان کے ہر بہی خواہ کو یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ فی الحقیقت سوال جُداگانہ اور مخلوط انتخاب کا نہیں۔ سوال ہندو اقتدار اور مسلم اقتدار کا ہے۔ ہندو مسلم کا اتحاد اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے۔ جب ہندو اور مسلمان جداگانہ حلقوں سے کھڑے ہوں۔ وہ قوم پرستی کے ایک آئینی فیصلے کے قائل ہوں۔ پھر ہندو ووٹر، ہندو قوم پرست کو اور مسلمان ووٹر مسلمان قوم پرست کو ووٹ دیں۔ اور اس طرح عوام الناس ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کا ثبوت دیں۔

مخلوط انتخاب زبردستی ٹھونسنے کا نتیجہ

اگر مخلوط انتخاب مسلمانوں پر زبردستی ٹھونسا جائے۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ بس یہی کہ بعض حلقوں سے ہندو ووٹروں، ہندو روپیہ اور ہندو اثر سے ایسے مسلمان منتخب ہو جائیں جو مسلمانوں کے مفاد سے قطع نظر کر کے ہندوؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جائیں۔ یا بعض ایسے ہندو منتخب ہو جائیں۔ جو رائے دہندوں کی مسلم اکثریت میں پھوٹ ڈال کر مسلمان اُمیدوار کو شکست دیدیں۔ اور اس طرح مسلم مفاد کو نقصان پہنچائیں۔

آئینی طور پر ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن آئین ناقص ہونے کی صورت میں ہسپانیہ اور روس کی خانہ جنگی سے زیادہ ہولناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ مخلوط انتخاب ان نتائج کو روک نہیں سکتا۔

اس لئے اگر ملک میں امن قائم رکھنا اور اتحاد و یگانگت سے کام چلانا مقصود ہو تو گریبان میں مُنہ ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ ایجی ٹیشن اور پراپیگنڈا کی غلغلہ اندازی وازیں عارضی فائدہ دے سکتی ہیں۔ مگر ان سے کوئی پائدار نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

(۶)

مخلوط انتخاب کا پہلا فارمولا

سائمن کمیشن کا تقرر

اصلاحات کی دس سالہ قسط کے وعدہ کو پورا کرنے کا وقت روز بروز قریب آرہا تھا۔ اس لئے ہندوستان میں سیاسی سرگرمی بڑھ رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ۱۹۲۶ء میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا۔ تاکہ وہ ہندوستان میں پہنچ کر حالات کی تحقیق کرے۔ اور اپنی سفارشیں برطانوی حکومت کے سامنے رکھے۔ اس کمیشن میں سب کے سب انگریز ارکان نامزد کئے گئے۔ کسی ہندوستانی کو اس کمیشن کا ممبر بنانا رموزِ مملکت کے منافی سمجھا گیا۔

اس کمیشن کے خلاف ہندوستان میں ہر طرف سے احتجاج ہونے لگا۔ اعتدال پسند سیاست دان بھی جو حکومت کے ساتھ ہر طرح تعاون کرنے کو ہمیشہ تیار رہا کرتے تھے۔ اس وقت اپنے آپ کو اور دیگر ہندوستانیوں کو اس کمیشن کی رکنیت سے محروم پا کر واویلا کرنے لگے

ہندوستانیوں کو اس کمیشن کی رکنیت سے محروم کرنے کو نسلی تعصّب کا نتیجہ قرار دیا گیا اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ ہونے لگا۔

تازہ چابک

سائمن کمیشن کے تازہ چابک نے سیاست دانوں کو اور چمکایا۔ اور وہ ہندوستان کے معاملے کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ مخلوط انتخاب اور ہندو مُسلم مسئلہ کے حل شور ہونے لگا۔ کانگرس نے بھی اس مسئلہ میں خاص دلچسپی لینی شروع کی۔

گوہاٹی کانگرس کا ریزولیوشن

۱۹۲۶ئہ کے آخری ایّام میں کانگرس کا اکتالیسواں اجلاس آسام کے شہر گوہاٹی میں ہُوا۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی:۔

"یہ کانگرس مجلس عاملہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ہندو مسلم رہنماؤں سے مشورہ کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کے موجودہ قابلِ افسوس اختلافات کو مٹانے کے لئے تجاویز مرتب کرنے کی خاطر فوری قدم اُٹھائے اور اپنی رپورٹ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو ۳۱ر مارچ ۱۹۲۷ئہ تک پیش کرے۔

"اور یہ کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو اختیار دیتی ہے۔ کہ وہ اس بارے میں ملک بھر کے سب کانگرسیوں کو ہدایات دے۔ اور مذکورہ بالا رپورٹ پر غور کرنے کے بعد جو اقدام مناسب سمجھے کرے۔"

مجلس عاملہ نے یکم جنوری کو کلکتہ میں اجلاس کرکے صدر کانگرس مسٹر سری نواس آینگر کو اختیار دیا۔ کہ وہ مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ہندو اور مُسلم ارکان کی ایک کانفرنس بلائیں۔ تاکہ ہندو اور مُسلم اتحاد کا کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مسٹر سری نواس

نے سب ممبروں کو یکجا بلانے سے پہلے ان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ گفتگو شروع کردی۔ اسمبلی کے اجلاس کے اختتام پر اُنہوں نے ایک اپیل بھی شائع کی جس میں باہمی اتحاد پر بہت زور دیا گیا۔ اور اختلافات کو دور کرنے کی تاکید کی گئی۔

فرقہ دارانہ انتخاب کے سلسلے میں ترمیم

۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو نئی دلّی میں کانگرس پارٹی کے ہندو ممبروں کا ایک جلسہ ہُوا۔ جس میں اس مسئلہ پر تبادلہ خیالات کیا گیا۔ کہ فرقہ دارانہ انتخاب کے موجودہ سلسلے میں کیا کیا ترمیم کی جانی چاہیئے۔

کچھ مسلم رہنما اسی روز ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر جمع ہوئے۔ اور اُنہوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا۔ باقی ہندو رہنماؤں نے بھی ان دنوں اس مسئلہ پر غور وخوض کیا۔

مشہور تجاویز دہلی

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو تقریباً ۳۰ مسلم رہنما ویسٹرن ہوٹل میں جمع ہوئے۔ اور اُنہوں نے موجودہ فرقہ وارانہ انتخاب کے سلسلے میں تبدیلیوں یا ترمیموں کے متعلق چھ گھنٹے تک سوچ بچار کی۔ ان رہنماؤں میں مسٹر جناح۔ مہاراجہ محمود آباد۔ سر محمد شفیع۔ سر ذوالفقار علی خاں۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا محمد علی۔ سر عبد القیوم۔ سر عبد القادر۔ سر محمد یعقوب بھی شامل تھے۔ مسٹر جناح اس جلسہ کے صدر تھے۔ انہوں نے حاضرین کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اور صدر کانگرس نے جو مختلف متبادل تجاویز بھیجی تھیں انہیں پڑھ کر سنایا۔ یہ تجاویز زیادہ تر مخلوط انتخاب کی بنیاد پر تھیں۔

طویل بحث وتمحیص کے بعد اس جلسہ نے خاص شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا۔ اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ "آئین اساسی کے کسی آیندہ خاکے میں

مجالس آئین ساز میں نمایندگی کے متعلق مسلمانوں کو مذکورہ ذیل تجاویز کی بنیاد پر سمجھوتہ منظور کر لینا چاہئیے :۔

(۱) سندھ کو بمبئی کے صوبہ سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔

(۲) شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچیستان میں اصلاحات اسی نہج پر رائج ہونی چاہئیں جس نہج پر وہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہوں۔

اس صورت میں مسلمان ان تمام صوبوں میں مشترکہ انتخاب قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اور وہ اس بات پر بھی رضامند ہیں۔ کہ وہ بنگال، پنجاب، سرحد اور دوسرے صوبوں میں ہندو اقلیتوں کو وہی مراعات ہیں۔ جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو دیجائیں

(۳) پنجاب اور بنگال میں نمایندگی کا تناسب آبادی کے تناسب سے ہوگا۔

(۴) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمایندگی ملے گی۔ اور وہ بھی مخلوط انتخاب سے۔

"ان تجاویز کی تصدیق مسلم جماعتوں کی طرف سے ہوگی۔ لیکن حاضرین کو اُمید ہے کہ ہندو ان تجاویز کو قبول کر لیں گے۔ اور مسلمان جماعتیں ان پر مہر تصدیق ثبت کر دینگی۔

"ملازمتوں کے سوال اور دوسرے مسئلے جو ایسے قانونی مسودوں یا تحریکوں کے بارے میں تحفظات کے متعلق ہوں۔ جو کسی فرقہ کے مذہب یا رواج و رسم پر اثر انداز ہوں یا جن کا مختلف فرقوں کے باہمی مفاد پر اثر پڑتا ہو۔ ان پر بھی جلسے میں بحث کی گئی۔ مگر اس کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور ان پر دوبارہ اس وقت غور ہوگا جب اس بڑی تجویز کو مقبولیت عام حاصل ہو جائے گی۔"

مخلوط انتخاب کے لئے مسلمانوں کا اقدام

ان تجاویز سے صاف ظاہر ہے کہ سب سے اوّل مسلمانوں نے ہی مخلوط انتخاب قبول

کرنے کے لئے قدم اٹھایا۔ گو مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جداگانہ انتخاب کے حق میں تھا۔ پھر بھی مسلم رہنماؤں نے جن میں ہر خیال کے لوگ شامل تھے مثلاً انتہا پسند مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری۔ قدامت پسند سر محمد شفیع۔ سر عبدالقیوم۔ سر ذوالفقار علی اور ان کے بین بین مسٹر جناح اور مولانا شفیع داؤدی نے اپنی قوم کو مخلوط انتخاب کا یہ فارمولا منظور کرنے کے لئے کہا۔ اس فارمولا سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہونا لازمی تھا۔ مگر اُنہوں نے اس اختلاف کو بھی گوارا کیا۔ اور ہند و مُسلم مفاہمت اور ہندوستان کی یگانگت اور مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے ہندوؤں کا ساتھ دینے اور اپنے مُسلم بھائیوں سے تھوڑی یا بہت مخالفت مول لینے کا حوصلہ کیا۔

اب ہم نے دیکھنا ہے کہ ان تجاویز کا کیسا استقبال ہُوا۔

کانگرس کی مجلس عاملہ کا محتاط اظہارِ خیال

ان تجاویز کے پیش ہونے کے اگلے روز ہی یعنی ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس نئی دہلی میں ہُوا۔ اور اس میں یہ تجویز منظور کی گئی:۔

مجلس عاملہ نے ہندوستان بھر کے مسلم نمائندوں کی غیر رسمی کانفرنس کی کارروائی پر غور و خوض کیا ہے۔ اور ساتھ ہی کانگرس پارٹی کے ہندو ممبروں کے جلسہ کی روداد بھی جو پچھلے ہفتہ ہُوا تھا۔ مجلس عاملہ اس غیر رسمی کانفرنس کے اس فیصلہ پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے۔ کہ تمام ملک میں اقلیتوں کے باہمی تحفّظ کے ساتھ سارے ملک میں مشترکہ انتخاب کے طریق کو قبول کر لیا جائے۔ مندرجہ ذیل سب کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمائندوں کے ساتھ تفصیلات پر بحث کرے۔ مسز سروجنی نائیڈو۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مسٹر سری نواس آینگر اور مولانا محمد علی۔ مجلس عاملہ کو اُمید ہے کہ اس بنیاد پر ہندوؤں اور

مسلمانوں کے درمیان تسلی بخش سمجھوتہ جلدی عمل میں لایا جائے گا۔"

اس طرح کانگرس کی مجلس عاملہ نے مخلوط انتخاب اور اقلیتوں کے متقابل حقوق پر خاص زور دیا اور باقی مسائل کو تفصیلات قرار دیکر گفتگوئے مفاہمت کی طرح ڈالی۔

غیر کانگرسی ہندو ممبروں کا رویّہ

مرکزی مجالس قانون ساز کے غیر کانگرسی ہندو ممبروں نے پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ۲۳ مارچ کو اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کی۔ اور اُنہوں نے مندرجہ ذیل اصولوں کو بناءِ گفتگو قرار دیا:۔

(۱) ملک کی تمام مجالس قانون ساز کے لئے انتخاب مخلوط ہو۔

(۲) ملک کی تمام مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کی جائیں۔

(۳) مذہبی اور نیم مذہبی حقوق کی حفاظت کے لئے آئین ملکی میں تحفظات مقرر کئے جائیں۔

(۴) صوبوں کی زبان یا دیگر ضروری وجوہ کی بنا پر از سرِ نو تقسیم کا مسئلہ غور کے لئے کھلا چھوڑا جائے۔ غیر کانگرسی ہندوؤں کے اس فیصلہ نے کانگرس کی محتاط روش سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس نے صوبوں کی تقسیم کے مسئلے کو کھٹائی میں ڈالنا چاہا۔ اور محض مخلوط انتخاب کو ہی اپنانا شروع کیا۔ ساتھ ہی اس نے مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دئے جانے کی مخالفت کردی۔

پنجاب کی ہندو سبھا

۲۳ مارچ کو پنجاب کی ہندو سبھا نے بھی ایک تجویز منظور کی جس میں کہا گیا کہ انڈین نیشنل کانگرس کو مسلمان جماعتوں سے گفتگو کرتے وقت ہندوؤں کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کا کوئی سمجھوتہ ہندوؤں کو پابند نہیں کریگا۔ اور ہندو مہا سبھا ہی ایسے معاملات کو طے کرسکتی ہے۔

سکھ نقطۂ نگاہ

۲۵ مارچ کو سردار منگل سنگھ نے جوان دنوں سنٹرل لیگ کے جنرل سکرٹری تھے، انڈین نیشنل کانگرس کے صدر کے نام ایک خط لکھا جس میں اور باتوں کے علاوہ کہا گیا کہ:۔

"سکھوں میں اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہے کہ جُداگانہ انتخاب قومیت کی ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ اس لئے وہ اس بُرے اصول کو کلیتہً ختم کرنے کے حق میں ہیں۔ بشرطیکہ مسلمان اس کو کلیتہً ترک کرنے کا فیصلہ کریں۔ بہتر ہوتا کہ وہ جرأت سے کام لیتے۔ اور نشستوں کی تشخیص کے بغیر مخلوط انتخاب کو قبول کرتے۔ مگر موجودہ حالات میں مخلوط انتخاب کو نشستوں کی تخصیص کے ساتھ بھی خوش آمدید کہنا چاہئے۔ مسلمان دوستوں نے بڑی فیاضی سے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ غیر مسلم اقلیتوں کو سندھ۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہی رعائتیں دینے کو تیار ہیں جو مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں ملیں گی۔ لیکن اُنہوں نے بڑی ہوشیاری سے پنجاب کے معاملے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سکھوں کا کیا بنے گا؟ میں پوچھتا ہوں۔ کیا وہ بہار اور یو۔پی کے مسلمانوں کی طرح ایک اقلیت نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر اُن سے نئے نظام میں کیا سلوک کیا جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جو بات میں آپ کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ پنجاب کے خاص حالات کو زیر غور کرانا چاہئے اور سکھوں کے لئے مناسب نمایندگی کا انتظام کیا جانا چاہئے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ سکھ ایک اہم اقلیت ہیں۔ جو بہت بڑی حیثیت رکھتی ہے۔"

اخبارات کا رویّہ

مَیں یہاں ہندو اور سکھ اخبارات کے تبصروں پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ نہ اس بحث میں پڑنے سے کچھ فائدہ ہے۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہے۔ کہ جو جس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے کہہ ڈالا۔ کسی نے نئے صوبوں کے قیام کے بارے میں اُلٹی سیدھی سنائیں۔ کسی نے پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت پر

آوازے کسے۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔

خلاصہ کلام

خلاصہ یہ کہ کانگرس کی محتاط روش سے آگے بڑھ کر ہندو ممبران نے توصوبوں کی نئی تقسیم اور مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دئے جانے پر حرف گیری کی سکھوں کی طرف سے ان کے رہنماؤں نے سردار منگل سنگھ کی طرح پنجاب کے بارے میں خالص قوم پرستی کے نام پر سکھ حقوق کی نگہداشت کا مطالبہ پیش کیا۔ انہیں یہ خیال تو آیا کہ بہار اور یو۔ پی میں مسلمان اسی نسبت سے ہیں جس نسبت سے پنجاب میں سکھ ہیں۔ لیکن وہ یہ حقیقت بھول گئے، کہ بہار اور یو۔ پی میں کوئی دوسری ایسی اقلیت نہیں جیسی کہ ہندوؤں کی پنجاب میں ہے۔ اگر بہار اور یو۔ پی میں مسلمانوں کی کوئی دوسری اقلیت ہوتی جو ۲۶ فی صدی تک پہنچتی، تو پھر دلیل قطعی ہوگئی تھی۔ مگر پنجاب میں جہاں سکھوں کی اقلیت ہے وہاں ان سے زیادہ تعداد میں ہندوؤں کی اقلیت ہے۔ ان دونوں کو ملایا جائے۔ تو مسلم اکثریت برائے نام رہ جاتی ہے۔ بہار اور یو۔ پی میں مسلمانوں کو زیادہ نشستیں دے کر ہندوؤں کا کچھ بگڑتا نہیں۔ مگر پنجاب اور بنگال میں ان سے اسی قدر نشستیں لینا گویا ان کو اقلیت میں تبدیل کرنا ہے۔

سردار منگل سنگھ کی تجاویز

۲۶ر اپریل کو سردار منگل سنگھ صاحب نے اخبارات کو ایک بیان دیا جس میں کہا گیا کہ:۔

(۱) انتخاب مخلوط ہو۔ (۲) اقلیتیں جہاں چاہیں ان کے لئے نشستیں مخصوص کی جائیں (۳) زبان کے لحاظ سے صوبوں کی از سر نو تقسیم کے مسئلے کا اس کے حسن و قبح کی بنا پر فیصلہ کیا جائے۔ اور صوبہ سرحد اور دوسرے نئے صوبوں کے لئے اصلاحات کا مطالبہ کیا جائے۔

اس فارمولا کی بنیاد یہ قرار دی گئی۔ کہ اکثریت کا کوئی تحفظ نہ کیا جائے۔ یعنی پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کیلئے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔ ہندو اور سکھ اگر چاہیں تو نشستوں کی تخصیص کا مطالبہ کریں۔ یعنی اگر پنجاب اور بنگال میں مخلوط انتخاب سے مسلمان اقلیت میں بھی آجائیں۔ تو ان کو کوئی تحفظ

(۷)

تجاویز دہلی کا حشر

مسٹر جناح کی تصریحات

تجاویز دہلی کو منظرِ عام پر آئے ہوئے ابھی دس روز بھی نہ گزرے تھے۔ کہ مسٹر جناح کو حالات نامساعد نظر آئے۔ اور اُنہوں نے ضرورت محسوس کی۔ کہ وہ ایک تصریحی بیان شائع کریں جس کے ذریعے اپنی اور اپنے ہم خیال احباب کی صحیح پوزیشن سب ملک کے سامنے رکھیں چنانچہ ۲۹ رمارچ کو انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک بیان دیا جس میں تجاویز دہلی کو مفاہمت کی بنیادی یا اوّلیں شرائط قرار دیا گیا۔ یعنی یہ کہ :-

(۱) سندھ کو بمبئی کے صوبے سے علٰحدہ کر کے نیا صوبہ بنایا جائے۔

(۲) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں

(۳) اور ہندوان مطالبات کی تائید کریں۔

اگر یہ شرطیں منظور ہو جائیں تو پھر ہی مسلمان مخلوط انتخاب کو نشستوں کی تخصیص کے ساتھ قبول کر سکیں گے۔ اور ہندو اقلیتوں کو سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نمایندگی کی وہ مراعات دیں گے۔ جو ہندو اکثریت مسلمانوں کو مسلم اقلیت کے صوبوں میں دینے کو تیار ہو۔ مراعات کا یہ مسئلہ دونوں فرقوں کی ذمہ وار کمیٹیوں کے ذریعے زیر بحث آسکتا ہے اور اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب اور بنگال میں نمایندگی آبادی کے تناسب سے ہوگی یعنی مخلوط انتخاب اور آبادی کے تناسب سے نشستوں کی تخصیص۔ اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کا تناسب ایک تہائی سے کم نہ ہوگا۔ مگر یہاں بھی انتخاب مخلوط ہی ہوگا۔"

ان شرائط کا اعادہ کرنے کے بعد مسٹر جناح نے اپنے بیان میں کہا کہ :-

"یہ پیش کش باہم وابستہ ہے۔ اور اس کو کلیتہً منظور یا مسترد کیا جا سکتا ہے۔ ہندو رہنماؤں نے ۲۳ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں اپنا جلسہ کرکے سب صوبوں کے نمایندوں کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جو ہندو رائے عامہ کا مشورہ لے کر واضح تجاویز مرتب کرے۔ اور جلدی رپورٹ پیش کرے۔ ان حالات میں مَیں اُمید کرتا ہوں۔ کہ ملک ان تجاویز پر جو پیش کی گئی ہیں۔ ٹھنڈے دل اور دماغ سے غور کرے گا۔ اور غیر جانبدارانہ ماحول قائم رکھے گا۔ میں یہ بتا دوں کہ اس پیش کش میں جو دور رس ہے۔ سب سے قابلِ ذکر یہ نوعیت ہے کہ اسمیں تسلیم کیا گیا ہے کہ جداگانہ انتخاب کو چھوڑ دو۔ اور پچھلے لوگ کے طریقہ کی بنا پر ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ جداگانہ اور مخلوط انتخاب بہرحال حصول مقصد کے لئے ایک طریقہ یا ذریعہ ہے جو مقصد پیش نظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان یہ محسوس کرنے لگیں۔ کہ وہ اکثریت کے تشدد سے محفوظ ہیں۔ اور انہیں یہ خوف نہیں ہونا چاہئے۔ کہ قومی حکومت کے کامل استدراج کی طرف درمیانی منزلیں طے کرتے وقت اکثریت ایسی پوزیشن میں ہوگی۔ کہ وہ اقلیت پر ظلم یا تشدد کر سکے۔

جیساکہ اکثریتیں دوسرے ملکوں میں کرنے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔"

مسٹر جناح نے اپنے بیان میں دیگر تصریحات بھی کیں۔ لیکن میں طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اس تصریحی بیان سے اس قدر واضح ہوجاتا ہے۔ کہ:۔

(۱) تجاویز دہلی جداگانہ انتخاب کی بجائے مخلوط انتخاب قائم کرنے کے لئے ایک وسیلہ تھیں

(۲) یہ تجاویز باہم دگر وابستہ تھیں۔ اور مسلم رہنماؤں کا خیال تھا۔ کہ ان کو کُلّیتہً تسلیم کرنا چاہیئے۔ ورنہ ان کو مسترد سمجھا جائے گا۔ یعنی اگر ان میں سے کسی ایک شرط کو نامنظور کر دیا جائے گا۔ تو باقی سب کچھ نامنظور تصوّر کیا جائے گا۔

باہم دگر وابستگی

یہاں ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا ہے۔ کہ ان تجاویز کو باہم دگر وابستہ کیوں کیا گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جیسا ہم اوپر کئی مضامین میں بیان کر آئے ہیں۔ ہندو رہنما مخلوط انتخاب پر زور دے رہے تھے۔ مگر وہ مخلوط انتخاب کے علاوہ اور باتوں کی طرف توجّہ دینے کو کم تیار تھے مسلمانوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ ان کی تجاویز کا یہ حشر نہ ہو کہ مخلوط انتخاب تو قبول کر لیا جائے۔ اور باقی تجاویز نامنظور ہوں۔

چنانچہ کانگرس کی مجلس عاملہ نے اپنی تجویز میں جو پچھلے مضمون میں درج ہو چکی ہے یہی کہا تھا۔ کہ" مجلس عاملہ اس غیر رسمی کانفرنس کے اس فیصلہ پر دلی پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے کہ تمام ملک میں اقلیتوں کے باہمی تحفّظ کے ساتھ سارے ملک میں مشترکہ انتخابیہ کے طریق کو قبول کر لیا جائے۔"

اسی طرح غیر کانگرسی ہندو ممبروں نے بھی مخلوط انتخاب کو تو قبول کیا تھا۔ مگر دوسری شرائط میں قطع و برید شروع کر دی تھی۔

مسلمانوں کے ایک طبقہ کو یہ بجا خدشہ تھا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ وہ چھوڑنا چاہتے ہیں۔ وہ تو ان سے چھڑوا لیا جائے۔ اور جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کو نہ دیا جائے۔ یہ خدشہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب اس بات پر دھیان دیں۔ کہ فیصلہ کرنے والی طاقت دراصل برطانوی حکومت تھی۔ اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی گفتگوؤں کی لازماً پابند نہ تھی۔

بہار کے مسلمانوں کی کارروائی

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بہار کے مسلمانوں میں دو فریق ہو گئے۔ ایک فریق تو ان تجاویز کا حامی تھا۔ اس کے لیڈر سر علی امام۔ مولانا شفیع داؤدی اور سید عبدالعزیز صاحب تھے۔ وہ تو ان تجاویز کے حق میں دلائل پیش کرتے تھے۔ مگر فریق مخالف ان تجاویز سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کرتا تھا۔ اس فریق کے لیڈر خان بہادر نواب محمد اسماعیل اور سر فخرالدین وغیرہ تھے۔ ۸ مئی کو بحث مباحثہ کے بعد ان لیڈروں نے پٹنہ میں حسب ذیل تجاویز منظور کیں:۔

"اس امر کے پیش نظر کہ ہندو قوم کے بعض رہنما ان تجاویز سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جو دہلی کی مسلم کانفرنس میں منظور کی گئی تھیں۔ اور خطرہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو ان کے جائز مطالبات تسلیم کئے جانے کے بغیر ہی جداگانہ انتخاب سے محروم کر دیا جائے گا۔

"اور اس امر کے پیش نظر کہ جداگانہ انتخاب اس وقت تک ضروری ہے۔ جب تک کہ فرقہ پرستی کا ملک میں دور دورہ ہے۔ اور برادرانِ وطن نے مسلمانوں کے تمام دوستانہ اقدامات کے باوجود فرقہ پرستی کی طرف نمایاں رجحان ظاہر کیا ہے۔ جیسا کہ پٹنہ میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے اجلاس میں حال ہی میں مسلمانوں کے جملہ مذہبی اور سیاسی حقوق کی علی الاعلان مخالفت سے ثابت ہے۔

اس لئے بہار اور اُڑیسہ کے مُسلمانوں کی یہ کانفرنس یہ رائے رکھتی ہے کہ جُداگانہ انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب رائج کرنے کی تجویز ابھی قبل از وقت اور مسلمانوں کے حقوق کے لئے ضرر رساں ہے۔ اور اس لئے یہ کانفرنس ہر اس کوشش کی مذمت کرتی ہے۔ جو مسلمانوں سے جُداگانہ انتخاب چھیننے کے لئے کی جائے۔ اور یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے۔ کہ مذکورہ بالا حالات میں مسلمان جداگانہ انتخاب کو چھوڑنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ صوبہ سرحد میں اصلاحات فوراً رائج ہونی چاہئیں۔ اور سندھ کو فوراً بمبئی سے علیحدہ کیا جانا چاہئیے۔ اور یہ کانفرنس اُمید کرتی ہے کہ ہندو اپنی تبدیلی دل کے ثبوت میں مسلمانوں کے اُن مطالبات کی تائید کرینگے اور اس طرح سیاسی اختلافات کو دور کرنے کا راستہ ہموار کرینگے۔"

بہار کے مسلمانوں کا یہ اظہار خیال اس نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو یہ خدشہ تھا۔ کہ کہیں وہ کچھ حاصل کئے بغیر ہی جُداگانہ انتخاب کو ہاتھ سے نہ کھو بیٹھیں۔

کانگرس کی مجلس عاملہ کا وسط مئی کا فیصلہ

ہندو اور مسلمان افراد اور جماعتیں اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہی تھیں کہ کانگرس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ۱۵ رمئی ۱۹۲۷ء اور بعد کی تاریخوں میں بمبئی میں منعقد ہؤا۔

مجلس عاملہ نے مارچ کے بعد کی کارروائیوں کا جائزہ لینے کے بعد ۱۵ رمئی کو تجاویز دہلی کے مقابلے میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی:۔

"مجلس عاملہ ان تجاویز پر جو مسلم رہنماؤں نے ۲۰ رمارچ کو دہلی میں منظور کی تھیں۔ اور ان آراء پر جو دوسرے رہنماؤں اور نمائندہ جماعتوں نے جن میں ہندو اور مسلمان شامل ہیں دی ہیں غور کرنے کے بعد یہ رائے رکھتی ہے کہ:۔

(۱) آئین اساسی کے کسی آئندہ خاکے میں جہاں تک مختلف مجالس قانون ساز میں نمایندگی کا تعلق ہے سب صوبوں اور مرکز میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب بنائے جائیں۔

(۲) دونوں بڑے فرقوں کو پورا اطمینان دلانے کے لئے کہ ان کے جائز مفاد مجالس قانون ساز میں محفوظ ہونگے۔ فی الحال اور اگر خواہش کی جائے تو فرقوں کی نمایندگی صوبجات اور مرکز میں مخلوط انتخاب کے ذریعے اور آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کرکے قائم کی جائیگی۔ بشرطیکہ اقلیتوں کو جن میں پنجاب میں سکھ بھی شامل ہونگے، باہمی رضامندی سے متقابل مراعات دی جائیں گی۔ تاکہ انہیں ایک یا زیادہ صوبوں میں آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں مل سکیں۔ اور جو تناسب اس طرح صوبوں میں قائم ہوگا۔ وہی مرکزی مجلس قانون ساز کی تشکیل میں برقرار رکھا جائے گا۔

(۳) الف۔ مسلم رہنماؤں کی یہ تجویز کہ صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان میں اصلاحات اسی نہج پر رائج کی جائیں۔ جس نہج پر دوسرے صوبوں میں ہیں۔ اس مجلس کی رائے میں جائز اور با دلیل ہے۔

ب۔ یہ تجویز کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے جدا صوبہ بنایا جائے۔ پہلے ہی کانگرس کے آئین میں صوبوں کی بروئے زبان تقسیم کی بنا پر منظور شدہ ہے۔ اور مجلس کی رائے ہے کہ اس پر عمل ہونا چاہیئے"۔

مجلس عاملہ کی قرارداد میں اور شقیں بھی تھیں۔ مگر ان کا بیان کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ ان کا مضمون زیر بحث سے براہ راست تعلق نہیں۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد

آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی گئی۔ اس میں ترمیمیں پیش ہوئیں۔ مگر مسٹر

جیکار کی ترمیم ہی منظور ہو سکی۔ اور ۱۶ رمئی کو یہ قرار داد اس قدر ترمیم سے منظور ہوئی۔ کہ سندھ کی علیحدگی کے سلسلے میں الفاظ یوں رکھے جائیں:۔

"اس تجویز کے بارے میں کہ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جلئے۔ اس کمیٹی کی رائے ہے کہ صوبوں کو زبان کی بنا پر تقسیم کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اور یہ اصول کانگرس پہلے ہی تسلیم کر چکی ہے۔

"اس کمیٹی کی یہ رائے بھی ہے کہ صوبوں کی ایسی نئی تقسیم فوراً کی جانی چاہئے۔ اور جو صوبے زبان کی بنا پر علیحدگی کا مطالبہ کریں۔ ان کا مطالبہ تسلیم کیا جانا چاہئے۔

"اس کمیٹی کی یہ رائے بھی ہے۔ کہ ابتداً آندھرا، سندھ اور کرناٹک میں علیحدہ صوبے قائم کئے جائیں۔"

بلوچستان کے متعلق جہاں اصلاحات کے رواج کا مطالبہ کیا گیا۔ وہاں عدالتی نظام میں اصلاح کے مطالبہ کا اضافہ بھی کیا گیا۔

کانگرس کی کارروائی کا اثر

اس طرح کانگرس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے تجاویز دہلی میں مذکورہ ردّ و بدل کیا:۔

(۱) پنجاب میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نشستیں دینے سے انکار کیا گیا۔ اور جہاں پہلے دو بڑے فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے جھگڑے ختم کرنے کا سوال تھا۔ وہاں اب پنجاب میں سکھوں کو درمیان میں لایا گیا۔

اس طرح تجاویز دہلی کا یہ حصّہ کہ پنجاب میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نشستیں دی جائیں، گویا عملاً نامنظور کر دیا گیا۔

(۲) مرکز میں آبادی کے لحاظ سے نشستوں کے تناسب کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس طرح ایک تہائی کی بجائے ایک چوتھائی کی نوبت آئی۔ اگر اس شق کا لحاظ بھی کر لیا جائے۔ کہ صوبجات اور مرکز میں باہمی مفاہمت سے نمایندگی آبادی کے تناسب سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔ پھر مرکز میں کم و بیش ایک چوتھائی نشستیں ہی مسلمانوں کے حصے میں آئیں۔ کیونکہ جتنی وہ بعض صوبوں میں حاصل کر سکتے تھے، قریباً اتنی ہی وہ دوسرے صوبوں میں واپس دینے کے پابند تھے۔

گویا آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے پنجاب کے متعلق سکھوں کے اور مرکز کے متعلق ہندو مہاسبھا کے نقطۂ نظر کو اپنایا اور مسٹر جناح کی ان تشریحات کو نظر انداز کر دیا۔ جو انہوں نے ۲۹ مارچ ۱۹۲۷ء کو اپنے بیان میں پیش کر دی تھیں۔ کہ یہ تمام تجاویز لازم و ملزوم ہیں۔ ان کو کلیتہً قبول یا مسترد کرنا ہوگا۔ گو آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور اس کی مجلس عاملہ نے صاف الفاظ میں تجاویز دہلی کو مسترد نہ کیا۔ تاہم اس نے ان میں گراں قدر ترمیم کر کے ان کو عملاً مسترد کر دیا۔

کانگرس نے اپنے سالانہ اجلاس میں اس نہج پر قدم بڑھاتے ہوئے تجاویز دہلی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اور ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت تک کانگرس آئین ہند تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اور دوسری جماعتوں سے اس بارے میں تعاون کر رہی تھی۔ اس لئے اسے تجاویز دہلی پر انحصار کرنا مناسب معلوم نہ ہوتا تھا۔

(۸)

مخلوط انتخاب کا دوسرا فارمولا

نہرو رپورٹ

مدراس کانگرس کا فیصلہ

۱۹۲۷ء کے آخر میں مدراس کانگرس نے فیصلہ کیا کہ سوراج کا آئین مرتب کرنے کے لئے دہلی میں مارچ ۱۹۲۸ء سے قبل ایک خاص کنونشن بلائی جائے۔ اس اجتماع خاص میں ہندوستان کی بہت سی جماعتوں کو مدعو کیا گیا۔ اور انہوں نے اس کارروائی میں حصہ لیا۔

نہرو کمیٹی

آئین کی ترتیب کے لئے ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو بنائے گئے۔ اس کے ارکان حسب ذیل تھے۔ سر علی امام۔ مسٹر شعیب قریشی۔ مسٹر اینے۔ مسٹر جیکار، مسٹر پردھان۔ سردار منگل سنگھ۔ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جوشی۔

مسٹر جیکار نے کہا کہ وہ کمیٹی میں کام کرنے کے ناقابل ہیں۔ اور مسٹر جوشی نے کہا کہ وہ فقط اس وقت حصّہ لیں گے جب مزدوروں کے معاملات زیر غور ہوں۔ سر علی امام علالت کے سبب سوائے ایک کے اور کسی اجلاس میں حصّہ نہ لے سکے۔

اس کمیٹی کی رپورٹ کو پنڈت نہرو کی صدارت کے باعث نہرو رپورٹ کا نام دیا گیا۔

فرقہ وارانہ فیصلہ

نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق حسب ذیل اُمور قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) یہ فیصلہ کیا گیا کہ جُداگانہ انتخاب کو ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ مخلوط انتخاب کو رائج کیا جائے۔ اس فیصلہ کی بناء یہ تخیل تھا کہ جُداگانہ انتخاب سے متحدہ قومیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور مخلوط انتخاب اس کا عمدہ ذریعہ ہے۔

(۲) مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعیّن بھی غیر مفید قرار دیا گیا۔ مگر جب یہ سمجھا گیا کہ اس صورت میں مُسلم اقلیّت کے صوبوں میں مسلمانوں کی نمایندگی تقریبًا نفی کے برابر رہ جائیگی۔ تو فیصلہ کیا گیا۔ کہ مُسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں حاصل شدہ پاسنگ سے محروم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ ان کو آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ مگر ان کو یہ حق رہے کہ وہ مزید نشستوں کو جیتنے کی کوشش کر سکیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں انتخابات کو کھلا رکھا گیا۔ اور کسی کے لئے کوئی نشست مخصوص نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(۴) مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمایندگی دینے سے انکار کیا گیا۔ اور ان کو اسی تناسب سے نمایندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو صوبجاتی نشستوں کے فیصلے کی رُو سے انہیں مرکز میں حاصل ہو سکیں۔

مسلمانوں پر اثر

ان فیصلوں کی رُو سے مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں موجودہ حصّے سے کم تجویز کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں ان کو قسمت آزمائی کے لئے کُھلا چھوڑا گیا۔ اور مرکز میں انہیں ایک تہائی کا یقین دلانے سے بھی انکار کیا گیا۔

پنجاب کا جھگڑا

مرکز کا فیصلہ ابھی معلق تھا۔ کہ صوبوں کے متعلق بحث وتمحیص ہونے لگی۔ جہاں تک مُسلم اقلیت کے صوبوں کا تعلق ہے۔ ان مُسلم نمایندوں نے جو آزاد خیال جماعتوں کی طرف سے نمایندگی کر رہے تھے۔ ان تجاویز کو جو ان صوبوں سے متعلق تھیں۔ اس اُمید اور تمنّا میں بلا احتجاج منظور کر لیا کہ پنجاب کے معاملے میں جھگڑا ہو جائے گا۔ پنجاب کے مُسلم نمایندے نشستوں کی تخصیص کے بغیر نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم نہیں کرینگے۔ اور اس طرح ان کی قوم پرستی پر بھی دھبّہ نہ لگے گا۔ اور نہرو رپورٹ کی پابندیوں سے قدم آزاد بھی ہو جائیں گے۔

لیکن اور صوبوں کا فیصلہ ہوتے دیکھ کر محض پنجاب کا جھگڑا چکانا باقی رہ جاتا تھا اس لئے سب بزرگوں نے پنجاب کی طرف خاص توجّہ مبذول کی۔

سکھّوں کا رویّہ

سکھ نمایندوں کا رویّہ بھی اسی بنیاد پر مبنی تھا۔ کہ پنجاب کے مُسلم رہنما نہرو رپورٹ کے فارمولے کو تسلیم نہ کرینگے۔ اور اس طرح ان کا دامن بھی فرقہ پرستی کے داغ سے آلودہ نہ ہو گا۔ اس لئے وہ بھی سکھوں کے لئے خاص نمایندگی کے دعوے کرنے کے بعد خالص قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بالآخر اس فارمولے پہ بات آئی۔ کہ:۔

(۱) ہر بالغ کو حق رائے دہی عطا کیا جائے۔

(۲) حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوں۔

(۳) کسی اکثریت یا اقلیّت کے لئے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

(۴) درجہ نوآبادیات کی حکومت قائم ہو۔

(۵) دس سال تک مذکورہ بالا شرائط پر عمل کرنے کے بعد اگر کوئی فرقہ ضروری سمجھے۔ تو فرقہ وارانہ نیابت کا سوال از سرِ نو زیر غور لایا جائے۔

مسلمانوں کی کیفیّت

جب تک پنجاب کے مُسلم رہنماؤں نے اس فارمولا کو تسلیم نہ کیا تھا۔ سب ہندو اور سکھ انہیں تسلیم کرنے کی تاکید کر رہے تھے۔ اور قوم پرستی کی کشتی کے ناخدا بننے کے لئے کہہ رہے تھے۔ اُدھر مُسلم اقلیت کے صوبوں کے رہنما چپکے چپکے انہیں اس فارمولا کو مسترد کرنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ تاکہ وہ اپنی غلط روش کے خمیازہ سے بچ نکلیں۔ مگر پنجاب کے مُسلم رہنماؤں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس فارمولا کو منظور کرکے ایک مرتبہ پھر اپنی قوم پرستی کا ثبوت دے ہی دیں۔

ان کا اس فارمولا پر دستخط کرنا ہی تھا کہ سکھوں اور ان کے ساتھ ہندوؤں کے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہیں اس فارمولا سے بیزاری اور اختلاف کا کم و بیش مظاہرہ شروع ہونے لگا۔

مسلمانوں پر اس فیصلہ کا اثر

مسلمانوں کے ایک فریق نے جو جُداگانہ انتخاب کا حامی تھا اس فیصلہ پر دستخط کرنے والوں کو اسلامی حقوق کا قاتل کہہ کر پروپگنڈا شروع کیا۔ مسلمانوں میں خوب لے دے ہوئی۔ جلسوں میں خوب تُو تُو مَیں مَیں بلکہ ہاتھا پائی تک نوبت آئی۔ لیکن چند روز کے پروپگنڈا کے بعد مسلمانوں کو سمجھ آنے لگی۔ کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مسلمان صوبجاتی معاملہ میں نہرو رپورٹ کے اس مشمولہ فیصلہ سے کچھ ایسے خسارے میں نہیں رہتے چنانچہ عام رجحان اس فیصلہ کے حق میں ہونے لگا۔

سکھوں اور ہندوؤں پر اس فیصلہ کا اثر

جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے۔ انہوں نے اس فیصلہ کے خلاف آواز اٹھانا شروع کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے نہرو رپورٹ کے ساتھ ایک ضمیمہ شائع کیا تھا۔ جس میں اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بنگال اور پنجاب میں مسلم اور غیر مسلم آبادیاں اس طرح سے تقسیم ہوئی ہیں۔ کہ مسلمان ان دونوں صوبوں میں نہ فقط آبادی کے لحاظ سے نشستیں لے جاسکیں گے۔ بلکہ اغلب ہے کہ اس سے بھی زیادہ نشستیں حاصل کر سکیں۔

جو بات پنڈت جواہر لال نے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کے لئے کی تھی۔ وہی ہندوؤں اور سکھوں کو پریشان کرنے کا باعث ہوئی۔ جوں جوں دن گزرنے لگے، انہیں مسلم اکثریت کا ہوّا ڈرانے لگا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو اپنی ڈھال بنایا۔ اور انہیں اس فارمولا کے خلاف اُکسایا۔

پنجاب کے ہندوؤں کے علاوہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور خود گاندھی جی بھی سکھوں کے ہمنوا ہوئے اور انہوں نے سکھوں سے صاف صاف کہا کہ اس فیصلہ میں ان سے ظلم ہُوا ہے نتیجہ یہ ہُوا کہ سکھوں میں اس فارمولا کی مخالفت زیادہ ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے اس فارمولا پر لکھنؤ میں دستخط کئے تھے، اس اعلان پر مجبور ہوئے کہ چونکہ ہماری قوم اس فارمولا کو قبول نہیں کرتی۔ اس لئے ہم اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس فارمولا کی موافقت سے دستبردار ہوتے ہیں

سر فضل حسین کی پیشین گوئی

ابھی نہرو رپورٹ کے سلسلے میں مسلمانوں میں ہی سر پھٹول جاری تھی۔ اور ہندو سکھ ابھی پیشین نے کوئی نمایاں پہلو اختیار نہ کیا تھا۔ کہ سر فضل حسین نے نہرو رپورٹ کے موافق اور مخالف سرکردہ کارکنوں کو ایک مجلس میں بلایا۔ اور مخالفت کرنے والوں سے کہا۔ کہ جو لوگ نہرو رپورٹ کے اس فارمولا پر دستخط کر آئے ہیں۔ وہ بے وقوف یا غدّار نہیں ہیں۔ آپس کی اس تھوکا فضیحتی سے

ہمیں رُکنا چاہئے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ اس فارمولا کو ہرگز قبول نہ کرینگے اگر وہ قبول کرلیں۔ تو مَیں سمجھتا ہوں۔ کہ اس فارمولا سے مسلمانوں کو نقصان ہونا اغلب نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی لڑائی چھوڑ کر ہندوؤں اور سکھوں کے تاثرات کا انتظار کرنا چاہئے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کا ہیجان بڑھتا گیا۔ اور آخر کار پنڈت مالویہ اور گاندھی جی بھی سکھوں کے بہی خواہ بن کر اس فارمولا کے مخالفوں کی صف میں کھڑے ہو گئے۔

کلکتہ میں مسٹر جناح کی کوششیں

کلکتہ میں کانگرس اور کانونشن کے اجلاس ۱۹۲۸ئہ کے آخر میں ہوئے۔ خلافت مسلم لیگ لبرل فیڈریشن۔ ہندو سبھا۔ سکھ لیگ اور دیگر متعدد جماعتوں کے نمائندے شمولیت کے لئے پہنچے۔ مسٹر جناح بھی وہاں آموجود ہوئے۔ غیر رسمی اور رسمی کارروائی میں مسٹر جناح نے حصہ لیا

مسٹر جناح نے مسلمانوں نے مسلمانوں کی طرف سے جو ترمیمیں نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ یا غیر فرقہ وارانہ مسائل میں پیش کیں۔ ان میں سے ضروری یہ ہیں :۔

(۱) اگر حکومت ہر بالغ کو حق رائے دینے سے انکار کرے۔ تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آبادی کے لحاظ سے نشستیں مخصوص کردی جائیں۔

اس مسئلے پر غیر رسمی گفتگو میں جو گاندھی جی اور دوسرے ہندو رہنماؤں سے ہوتی رہی مسٹر جناح نے بڑے زور سے کہا کہ میں مخلوط انتخاب چاہتا ہوں۔ مَیں جداگانہ انتخاب کی طرف جانے کے ناقابل نہیں...... اگر یہ ترمیم منظور کرلی جائے۔ تو پھر میرے ہاتھ بندھ جائیں گے اور میں جداگانہ انتخاب کی طرف نہیں جاسکوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ حکومت حق رائے دہی بالغان کو تسلیم نہ کرے گی۔ اور پھر جداگانہ انتخاب کا دروازہ کھل جائے گا۔

گاندھی جی نے جواب دیا کہ مَیں حق رائے دہی بالغان کے مقابلے میں اور کسی تبادل صورت کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر ہر کسی کے ہاتھ کھُلے ہیں۔

(۲) مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔

اس مطالبہ کو بھی غیر رسمی یا رسمی کانفرنس میں قبول نہ کیا گیا۔

(۳) بقیہ اختیارات (Residuary powers) مرکز کی بجائے صوبوں کو حاصل ہوں

اس مسئلہ پر بھی کانگرسی اور غیر کانگرسی رہنماؤں نے مُسلم نقطۂ نگاہ کو قبول نہ کیا۔

گاندھی جی کا الٹی میٹم اور نہرو رپورٹ کا حشر

نہرو رپورٹ کے پنجابی فارمولا میں کوئی ترمیم سکھوں کے منشاء کے مطابق نہ کی گئی۔ گو گاندھی جی اور مالویہ جی کا اختلاف منظرِ عام پر آ گیا۔ تاہم گاندھی جی نے اسی رپورٹ کو ہاتھ میں لے کر برطانوی حکومت کو چیلنج دیا۔ کہ ایک سال کے اندر اندر اس رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں نیا آئین رائج کیا جائے۔

جب ایک سال گزرنے پر حکومت نے اس الٹی میٹم کو ٹھکرا دیا۔ اور اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اُٹھایا۔ تو گاندھی جی کے زیرِ ہدایت کانگرس نے ۱۹۲۹ء میں لاہور کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کو راوی کی لہروں میں غرق کر دیا۔ اور یہ کہا کہ ہم کوئی ایسا فارمولا لائیں گے جو سب قوموں کو قابلِ قبول ہو۔

ہماری نگاہیں آج تک اس فارمولا کی تلاش میں ہیں۔ لیکن ابھی نہ وہ فارمولا نظر آیا۔ اور نہ فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ ہو سکا۔

نہرو رپورٹ کے فارمولا کو ٹھکرا کر ہندوؤں اور سکھوں نے اس امر کا ایک اور ثبوت دیا کہ وہ فی الحقیقت مخلوط انتخاب کے خواہاں نہیں۔ بلکہ کسی اور شے کی تمنا میں ہیں۔

(۹)

مخلوط انتخاب کا تیسرا فارمولا

پنجاب ریفارمز کمیٹی کی رپورٹ

تجاویز دہلی اور نہرو رپورٹ کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم ایک اور فارمولا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو پنجاب کے سامنے آیا۔ پنجاب کا مسئلہ ہی ہمیشہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کی حل کی راہ میں بدترین رکاوٹ رہا ہے۔ یہیں فیصلے کی خاص کوششیں ہوئیں۔ اور سب بیکار گئیں۔

پنجاب ریفارمز کمیٹی

سائمن کمیشن کی آمد پر مختلف صوبوں میں کونسلوں کے ممبروں کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ جو سائمن کمیشن کے ساتھ مل کر اور اس کا کام آسان بنانے کی خاطر کارروائی کرتی تھیں۔ پنجاب کی اس ریفارمز کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے:۔

سر سکندر حیات خاں صدر۔ مسٹر اوون رابرٹس۔ چودھری چھوٹو رام۔ چودھری ظفراللہ

خاں۔ راجہ نرندرا ناتھ۔ ڈاکٹر گوکل چند اور سردار اجل سنگھ۔

اس کمیٹی نے ۱۹۲۹ء میں تحقیقات اور بحث وتمحیص کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے ساتھ راجہ نریندرا ناتھ اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے مل کر اپنا علیحدہ اختلافی نوٹ شامل کیا۔ اور سردار اجل سنگھ نے اپنا علیحدہ اختلافی نوٹ شامل کیا۔

مخلوط انتخاب کا فارمولا

ہمیں اس جگہ اس رپورٹ اور ان اختلافی نوٹوں کے متعلق فقط یہ کہنا ہے۔ کہ مُسلم ارکان نے اپنی رپورٹ میں اور تجویزوں کے علاوہ یہ تجویز پیش کی۔ کہ اگر آئندہ پنجاب اسمبلی میں نشستوں کی تعداد طاق رکھی جائے۔ یعنی ایسی تعداد جو دو پر تقسیم نہ ہو سکے۔ تو مسلموں اور غیر مسلموں کی نشستوں میں فقط ایک نشست کا فرق رکھا جائے۔ یعنی آخری فالتو نشست مسلمانوں کو دی جائے۔ مثلاً اگر ۱۰۱ نشستیں مقرر کی جائیں۔ تو ایک سو ایک نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں۔ اور اگر ایک سو پچھتر نشستیں مقرر ہوں۔ تو ان میں سے ۸۸ نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں۔ اور ۸۷ نشستیں غیر مسلموں کو دی جائیں۔ اور حلقہ ہائے انتخاب کو مخلوط رکھا جائے۔

مُسلم راج کی رٹ

مگر راجہ نرندرا ناتھ اور ڈاکٹر گوکل چند نارنگ ایک طرف اور سردار اجل سنگھ صاحب دوسری طرف اس تجویز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

پنجاب کے صوبے میں ایک مُسلم نشست کی اکثریت بھی منطقی حیثیت سے ہندوؤں اور سکھوں کے لئے کیسے قبول ہو سکتی تھی۔ کہ جب وہ تجاویز دہلی کو مسترد کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو بھی لات رسید کر چکے تھے۔ ان کو تو پنجاب میں ایک مسلم نشست کی زیادتی بھی

ظالمانہ زیادتی اور مسلم راج نظر آتی تھی چنانچہ ملک کے طول وعرض میں تقریروں اور تحریروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آنے لگا جس نے صاف صاف کہہ دیا۔کہ پنجاب میں مسلم راج قائم نہیں ہو سکتا۔پنجاب کا ہندو اور سکھ کٹ مریگا۔لیکن پنجاب میں مسلم راج قائم نہیں ہونے دیگا۔

یہ پراپیگنڈا تھا جس نے برسوں پنجاب کے کونے کونے میں اودھم مچایا۔اور سکھوں اور ہندوؤں کو مسلم راج کے قیام کے خلاف اُکسایا۔

سردار اجل سنگھ نے تو اپنے اختلافی نوٹ میں وہی بات لکھ دی۔جو سردار منگل سنگھ نے تجاویز دہلی پر تبصرہ کرتے وقت کہی تھی۔کہ اگر مسلمانوں کو یو۔پی میں ۱۴ فی صدی آبادی ہوتے ہوئے ۳۰ فی صدی نشستیں مل سکتی ہیں۔تو سکھوں کو اسی قدر تناسب آبادی کے ہوتے ہوئے اسی قدر نشستیں کیوں نہیں مل سکتیں۔یہ منطق بظاہر بہت سیدھی تھی۔مگر اس میں کچھ ٹیڑھا پن بھی موجود تھا۔اور وہ یہ کہ یو۔پی میں ہندو اکثریت مسلمانوں کو تیس فی صدی نشستیں دے کر کافی اور غالب اکثریت رہتی تھی۔مگر پنجاب میں سکھوں کے ساتھ ہندو اقلیت موجود تھی۔اس لئے مسلم اکثریت کلیتہً اقلیت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

اگر سکھوں کو ۱۴ فی صدی ہونے کی بنا پر ۳۰ فی صدی نشستیں دی جائیں۔اور ہندوؤں کو ۲۶ فی صدی نشستیں ہی دی جائیں۔تو یہ دونوں ہی ۵۶ فی صدی ہو گئے۔اور عیسائی اور یورپین ان کے علاوہ رہے۔بلکہ منطقی لحاظ سے تو پوزیشن اور بھی واضح کی جاسکتی ہے۔اور وہ یوں کہ اگر ۱۴ فی صدی سکھوں کو ۳۰ فی صدی نشستیں ملیں۔تو ۲۶ فی صدی ہندوؤں کو کیوں حق نہیں۔کہ ان کو بھی اسی تناسب سے نشستیں ملیں۔اگر ۱۴ کی بجائے ۳۰ ملتی ہیں۔تو

۴۶ کی بجائے ۵۵ کیوں نہیں ملتیں۔ پس اس طرح ۳۰ نشستیں سکھوں کو اور ۵ نشستیں ہندوؤں کو۔ اور کم از کم ۵ فی صدی نشستیں یورپینوں، عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کو مل جائیں۔ اور جو باقی بچے وہ مسلم اکثریت کا حصّہ رہے۔

منطقی لحاظ سے یہ حساب کچھ ایسا غلط نہیں۔ لیکن یہ ٹیڑھی منطق مسئلہ کو ٹیڑھی کھیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اور پھر فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنا "حلوہ خوردن را روئے باید" کا مصداق بن کر رہ جاتا ہے۔

سکھوں کی طرف سے آج بھی اسی منطق کو دہرایا جا رہا ہے۔ اور ہندو بھی اپنی خاموشی سے اس کے بارے میں نیم رضا کا رویّہ ظاہر کرتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ بعض وقت تو علانیہ اس کی تائید بھی ہوئی ہے۔

ان حالات میں مجھے پھر ایک بار یاد دلانا اور دہرانا پڑتا ہے۔ کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ یا باہر کے ہندو مخلوط انتخاب کے حامی نہیں۔ ورنہ طاق نشستوں میں سے ایک فالتو نشست مسلمانوں کو دے کر فیصلہ کر لینا اور مخلوط انتخاب کو رائج کر لینا ایسا سستا سودا تھا کہ اس سے سستا سودا کبھی ممکن نہ ہو سکتا تھا۔

لیکن کوئی فیصلہ کرنے کا خواہاں ہی نہ تھا اس لئے فیصلہ کیسے ہوتا!

(۱۰)

رَدِّ عمل

برطانوی حکومت نے کانگرس کے اس الٹی میٹم کی پرواہ نہ کی۔ جو کلکتہ میں ۱۹۲۸ء کے آخر میں دیا گیا تھا۔ اور ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے لاہور کے اجلاس میں آزادی کامل کی قرارداد منظور کر دی۔ اس قرارداد کے ذریعے نہرو رپورٹ کو بھی دریا بُرد کر دیا گیا۔ اور تقریروں میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی۔ کہ فرقہ وارانہ مسائل کا ایسا فیصلہ پیش کیا جائے گا۔ جو نہرو رپورٹ کے فیصلوں سے بھی زیادہ ہر دلعزیز ہوگا۔

سول نافرمانی

مگر ۱۹۳۰ء میں کانگرس کی تمام تر توجہ آئینی مسائل سے ہٹ کر غیر آئینی جدوجہد کی طرف رہی۔ کیونکہ حکومت کے کورے جواب کے بعد اس کی مخالفت میں کسی تحریک کا جاری کیا جانا ناگزیر تھا۔

نمک کی سول نافرمانی اور ڈانڈی مارچ کے قصے سیاسی مسائل سے دلچسپی

رکھنے والوں کو بخوبی یاد ہیں۔ مجھے یہاں ان کو بیان کرنا مقصود نہیں۔ کیونکہ ان کا مضمون زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

ملک میں ہیجان برپا ہوا۔ ہزاروں لوگ ہر صوبہ سے جیل میں گئے۔ اُدھر لندن میں گول میز کانفرنس کی تجویزیں اور ان پر عمل ہونے لگا۔ ۱۹۳۱ء کے ابتدائی ایام تک سول نافرمانی کا سلسلہ جاری رہا۔

گاندھی ارون معاہدہ

آخر لارڈ ارون وائسرائے ہند نے گاندھی جی سے گفتگو کر کے انہیں لندن جانے پر رضامند کیا عدم تشدد کے قیدیوں کو عفو عام کے ذریعے رہا کر دیا گیا۔

گاندھی جی کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے لندن کی گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کے خواہاں تھے وہ اپنے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنا پسند نہ کرتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کو بھی اپنے ساتھ کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے نہ لیا۔ مگر کوشش کی کہ انہیں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت دعوت شمولیت دے۔

لیکن سر فضل حسین اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے حکومت پر اپنی جانب سے دباؤ ڈالا اور ڈاکٹر انصاری کو کانگرس کے علاوہ مسلمانوں کا نمائندہ بن کر گول میز کانفرنس میں شامل ہونے سے محروم رکھا۔

مگر اس قضیئے کے ساتھ ایک اور دقت درپیش تھی۔ اب گاندھی جی لندن میں مخلوط انتخاب کا کوئی بہتر فارمولا لے کر جانا چاہتے تھے۔

مسلم نیشنلسٹ کانفرنس لکھنؤ

مگر نہرو رپورٹ کے غرق ہو چکنے کے بعد اب کوئی مشترکہ فارمولا نہ تھا۔ گاندھی جی

خود اپنی جانب سے کوئی بات کہنے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنا کام دوسروں کے ذریعے انجام دلانا ہی بہترین سیاست سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری اور ان کے ہمنوا لوگ لاہور کانگریس کے وقت سے ہی ایک مسلم نیشنلسٹ پارٹی بنا چکے تھے۔ اس لئے اس وقت اس سے کام لینا معمولی بات تھی۔ گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے لکھنؤ میں ایک نیشنلسٹ یا آزاد مسلم کانفرنس طلب کی گئی۔ اپریل کا مہینہ تھا۔

مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی ایک قرارداد

ہمیں اس وقت اس مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی ایک ہی قرارداد سے بحث ہے۔

ہمارے قارئین کو علم ہے کہ اس وقت تک پنجاب کا معاملہ ہی فرقہ وارانہ فیصلے میں ایک سدِّ سکندری ثابت ہؤا تھا۔ اب اس کو طے کرنے کے لئے ایک تازہ تدبیر سوچی گئی۔

سکھوں اور ہندوؤں کی طرف سے جہاں اور باتیں کہی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بات یہ بھی تھی۔ کہ نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کو مُسلم اقلیّت کے صوبوں میں آبادی کے مطابق نشستیں مخصوص کرنے کے بعد یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ مزید نشستوں کے لئے انتخابی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ اس اصول پر پنجاب میں سکھوں کے لئے کیوں عملدرآمد نہ کیا جائے۔ اور آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر کے انہیں اور نشستوں کے لئے انتخابی جنگ لڑنے کا حق کیوں نہ دیا جائے

آزاد خیالوں کی جلد بازیاں

ہمارے آزاد خیال دوست گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے لئے بے تابی کا اظہار فرما رہے تھے۔ گاندھی جی یا کانگریس کے دوسرے لیڈروں نے ان سے کیا کہا یا نہ کہا اس بات کا علم تو انہیں میں سے کسی کو ہوگا۔ ہمیں اس کا نہ علم ہے۔ اور نہ ہم اس بارے میں کچھ کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو فقط یہ عرض کرنا ہے کہ گاندھی جی

نے اپنے کندھوں پر کسی نئی تجویز کا بار نہ لیا۔ وہ بار لکھنؤ میں جمع ہونے والے آزاد خیال مسلمانوں نے اپنی گردن پر اٹھایا۔ اُنہوں نے اپنی جلد بازی میں ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں کہا گیا۔ کہ ہندوستان کے سب صوبوں میں یہ اصول برتا جائے۔ کہ جہاں کسی فرقہ کے لوگ ۳۰ فی صدی سے کم ہوں۔ ان کے لئے آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کردی جائیں۔ اور انہیں حق دیا جائے۔ کہ وہ مزید نشستوں کے لئے انتخابی جنگ لڑ سکیں۔

مُسلم اقلیت کے صوبوں کے رہنماؤں کی بے پروائیاں

اوّل تو اس قرارداد کے سلسلہ میں اکثریت کے صوبوں کو پہلے سے علم ہی نہ تھا۔ کہ کیا ہونے والا ہے۔ دوم بنگال پر اس سے کچھ زیادہ اثر نہ پڑتا تھا۔ اس لئے بنگالیوں کو کوئی پروا نہ تھی۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اجلاس میں غالباً غیر موجود تھے۔ پنجاب سے جو ایک آدھ بھولا بھٹکا گیا تو اس کا قصہ ہمیں معلوم نہیں۔ ہم اس کانفرنس میں شامل نہ تھے اور نہ ہمیں قبل از وقت علم تھا کہ اس قسم کی کوئی قرارداد لکھنؤ میں پیش کی جائے گی۔

اس وقت تک تو آزاد خیال احباب کی پوزیشن یہی رہی تھی۔ کہ نہرو رپورٹ کے فارمولے کو ہی نافذ کیا جائے۔ اس لئے پنجاب میں کوئی پریشانی نہ تھی۔

لیکن جب اس قرارداد کی اشاعت ہوئی۔ تو پنجاب بھر میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ آزاد خیال رہنماؤں سے اختلاف کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ وہ لوگ جو اس وقت تک مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ وہ بھی اپنا جداگانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

نیشنلسٹ

لکھنؤ کی مُسلم کانفرنس کے رہنماؤں سے پوچھا گیا۔ کہ تیس فی صدی اقلیتوں کے لئے

نشستیں حاصل کرنے کا حق دینے سے کیا پیش نظر تھا۔ وہ اپنے جواب میں یہی کہہ سکتے تھے اور اُنہوں نے کہا کہ ہم نے سکھوں کے معاملے کو چکانے کے لئے ایسا کیا ہے۔

سوال کیا گیا کہ پنجاب پر اس قرارداد کا اثر ہوگا۔ اس کا بھی کچھ خیال کیا ہے؟ جواب ملا کیا اثر ہوگا؟

ہمارے بزرگوں کو یہ خیال بھی شاید نہ تھا۔ کہ اثر کیا ہو۔ ان کے ذہن میں فقط سکھوں کا خیال تھا جس کو وہ اپنی صفائی میں دلائل کے ساتھ پیش کرنے کے متمنّی تھے۔ مگر جب ان سے کہا گیا۔ کہ پنجاب میں کئی ایک اقلیتیں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک ۳۰ فی صدی سے کم ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی ان کی تعداد ۴۵ فی صدی تک پہنچتی ہے۔ اس لئے اگر سکھوں کے لئے ۱۴ فی صدی۔ ہندوؤں کے لئے ۲۶ یا ۲۷ فی صدی اور باقی اقلیتوں کے لئے ۴ یا ۵ فی صدی نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ پھر تو صورت حال یہ ہو گی کہ باقی ۵۵ فی صدی نشستیں سب مسلمانوں۔ ہندوؤں۔ سکھوں۔ عیسائیوں۔ یورپینوں وغیرہ کے لئے میدانِ جنگ بن جائیں گی اور پنجاب کی غیر مسلم اقلیتیں جو حکومت۔ دولت۔ علم۔ ملازمت۔ کارخانہ داری زمینداری اور دیگر اثر و رسوخ کے لحاظ سے مسلمانوں سے فائق ہیں۔ وہ پچپن فی صدی نشستوں سے مسلمانوں کو حتی الوسع محروم کرنے کے لئے اپنی سب قوتیں صرف کر دیں گی۔

ہمارے کرم فرماؤں کا اظہار حیرت

ہمارے آزاد خیال دوستوں سے اس کے سوا کچھ بن نہ پڑا کہ وہ حیرت آمیز مسکراہٹ سے یہ فرما دیتے۔ اوہو! ہمارے ذہن میں تو یہ صورتِ حال بالکل نہ تھی۔

مگر اب کیا ہو؟

اس سوال کا جواب آیندہ مضمون میں درج ہے۔

مجلس احرار اسلام کا قیام

ہندوستان میں مجلس خلافت کے وسیع نظام نے تھوڑے ہی دن عروج پایا۔ اور چند سالوں کے بعد وہ اپنے رہنماؤں کی باہمی خلفشار اور ناقابلیتوں کا شکار ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء میں جب کلکتہ میں کانگرس اور کانونیشن کے اجلاس ہو رہے تھے خلافت کا اجلاس بھی وہیں ہو رہا تھا۔ مجلس مرکزیہ خلافت کے اجلاس سالہا سال سے باہمی فتنہ و فساد کا ہنگامہ بن رہے تھے۔ کلکتہ میں توبت یہاں تک پہنچی کہ چھریوں سے بڑھ کر پستولوں تک کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ اس لئے ایک فریق نے یہی سمجھا کہ اب خلافت کے نام سے کام کرنا ترک کر دیا جائے۔ تاکہ اس روز روز کے فساد کا قصہ ختم ہو۔

کچھ عرصے کے بعد لاہور میں مجلس احرار اسلام کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس میں وہی لوگ شامل تھے۔ جو ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ اور مجلس خلافت کے رکن بھی تھے۔

لاہور میں پہلی احرار کانفرنس

۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں پہلی احرار اسلام کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نئی جماعت نے اپنا اظہار خیال علی الاعلان کیا۔

۱۱ر جولائی تک بہت کچھ باتیں ہو چکی تھیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے لئے اُس قرارداد کو دیکھ لینا کافی ہے جو اس کانفرنس میں ہندوستان کے آئین اساسی کے بارے میں منظور کی گئی۔ وہ قرارداد حسب ذیل ہے:-

”ہرگاہ کہ مارچ ۱۹۲۷ء میں مختلف مسلم جماعتوں کے کئی ایک مقتدر رہنماؤں کی پیش کردہ دہلی کی تجاویز کو جن میں تجویز کیا گیا تھا۔ کہ تمام فرقوں کے لئے تمام صوبوں

میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کردی جائیں۔ اور حلقہ ہائے انتخاب کو مخلوط کر دیا جائے اور پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کے قبول نہ کیا۔ اور

"ہرگاہ کہ مسئلہ پنجاب کا وہ حل جو نہرو رپورٹ نے پیش کیا اور جس کو ۱۹۲۸ء کے ہندو مسلم میثاق میں جو لکھنؤ میں ہوا منضبط کیا گیا اور جس میں سفارش کی گئی تھی کہ سب بالغوں کو حق رائے دے کر مخلوط انتخاب کا سلسلہ جاری کیا جائے اور کسی فرقے کے لئے پنجاب میں نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔ تمام سکھ قوم نے حتیٰ کہ میثاق لکھنو پر دستخط کرنے والوں نے بھی نامنظور کیا۔ اور ہندوؤں نے سکھوں کی علانیہ تائید کی" اور

"ہرگاہ کہ خود گاندھی جی نے ۱۹۲۸ء کے اس میثاق پنجاب سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور یہ اعلان کر کے کہ اس میں سکھوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اُس واحد تجویز کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جس پر رضامندی باہمی کی اُمید ہوسکتی تھی" اور

"ہرگاہ کہ پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے حق رائے دہی بالغان کی علانیہ مخالفت شروع کردی ہے" اور

"ہرگاہ کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کے ساتھ باعزت اور برادرانہ سلوک روا رکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور بدستور چھوت کی شکل میں مسلمانوں کے ساتھ سوشل بائیکاٹ کو جاری رکھتے ہوئے متحدہ قومیت کے راستے میں روز افزوں مشکلات پیدا کر رہی ہے"

"ہرگاہ کہ ہندو اور سکھ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے لئے محض اپنے فرقہ وارانہ مفاد کی خاطر چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ اور اپنی انتہائی فرقہ پرستی کو نام نہاد قومیت کے لباس میں ظاہر کر رہے ہیں" اور

"ہرگاہ کہ گاندھی جی نے بھی اصرار کیا ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ وہ ہونا چاہئے پیشتر اس کے

کہ وہ قابل التفات ہو سکے" اور

"ہرگاہ کہ مسلمانوں کے اعتدال پسند اور قدامت پسند جداگانہ انتخاب کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں" اور

"ہرگاہ کہ مخلوط انتخاب کے ہر اس فارمولے سے جو مسلمان قوم پروروں کے نزدیک قابلِ قبول تھا۔ پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ اور اب معاملات کا زیادہ دیر تک کھٹائی میں پڑا رہنا بے سود ہے" اور

"ہرگاہ کہ کمال سنجیدگی اور عزم سے یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر کوئی ایسا آئین رائج کیا گیا، خواہ وہ نہرو رپورٹ کے مطابق ہی کیوں نہ ہو جس میں صوبہ کے لئے امکان ہو کہ مسلمان کی اکثریت کو مخلوط انتخاب کے ذریعے بھی مجلس وضع قوانین پنجاب میں منتخب کرا سکے تو سکھ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ اور ہندو، سکھوں کی پشت پناہی پر ہیں۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ موعودہ مصیبت کے تدارک کے لئے شیرازہ قوم کا انتشار کیا جائے" اور

"ہرگاہ کہ ہندو اور سکھ اس بات کے لئے تیار نہیں کہ مسلمانوں کے لئے مرکزی حکومت میں یا کسی بڑے صوبے کی حکومت میں فائق حیثیت حاصل کرنے کا ذرّہ برابر بھی امکان ہو اس لئے اس کانفرنس کی رائے ہے کہ موجودہ حالات میں جداگانہ انتخاب جاری رہنا چاہیئے۔ اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کی مجالس وضع قوانین میں نشستوں کی اکثریت مسلمانوں کو حاصل ہونی چاہیئے۔ اور مخلوط انتخاب جو متحدہ قومیت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اس کا اجرا اسی وقت تک معرضِ التوا میں رہنا چاہیئے، جب تک کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف اپنے جارحانہ اور معاندانہ رویّے سے دست کش نہ

ہو جائیں اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں فراخ حوصلگی، رواداری اور ہندوستانی برادری کا ثبوت عملاً پیش کر کے متحدہ قومیّت کے لئے خوش گوار فضا پیدا نہ کریں۔"

اس قرارداد کی تشریح میں کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ یہ خود اپنی تشریح ہے۔ اس میں وجوہات کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں اور نتیجہ صاف اور غیر مبہم ہے۔

اس قرارداد سے ہمارے قوم پرور دوستوں اور رہنماؤں کو بے حد صدمہ ہوا لیکن اس صدمے کے لئے وہ بذاتِ خود ذمّہ وار ہے۔

غیر مسلم کیسا مخلوط انتخاب چاہتے ہیں

مسلمانوں کو ہمیشہ یہ اندیشہ رہا ہے کہ ہندو جب مخلوط انتخاب پر زور دیتے ہیں۔ تو وہ قوم پرری کے نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ اپنے فرقہ وارانہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے۔ وہ کوئی ایسا فارمولا چاہتے ہیں جس سے مسلمان مرکز اور بڑے صوبوں میں بیکار ہو کر رہ جائے۔

مرکز میں تو مسلمان نے ایک تہائی نشستوں کا ہی مطالبہ کیا۔ اس کو زیادہ مانگتے شرم سی آتی تھی۔ مگر ہندوؤں کو یہ بھی منظورِ خاطر نہ ہوا۔ ایک تہائی نشستوں کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مرکزی حکومت پر حاوی نہ ہوتے بلکہ ہمیشہ ایک کم حقیقت اقلیت رہتے۔ مگر ہندو کی قوم پرستی اس کو اس حالت میں رکھنا بھی آسانی سے گوارا نہ کر سکتی تھی۔

بڑے صوبوں کا ذکر

صوبوں کے ذکر میں قارئین کو خیال ہو گا کہ میں بڑے صوبوں کی بات کیوں کہتا ہوں مجھے بڑے صوبوں اور چھوٹے صوبوں کی بات اس لئے کرنا پڑتی ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، یا سندھ کو علیحدہ کر کے قائم کی جا رہی تھی، وہ دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے تھے۔ ایک وہ صوبے جو اپنا خرچ موجودہ نظام کی موجودگی میں خود برداشت

نہیں کر سکتے۔ اور ایک وہ جو کر سکتے ہیں۔ مُسلم اکثریت کے پانچ صوبے پیش نظر تھے۔ بنگال، پنجاب سندھ، سرحد اور بلوچستان۔ ان میں سے پنجاب اور بنگال بڑے صوبے کہلاتے ہیں۔ اور یہ اپنا خرچ خود برداشت کر سکتے ہیں۔

سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبے اپنا سارا خرچ خود برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ مرکزی حکومت کے دست نگر ہیں۔ مرکز کروڑ ڈیڑھ کروڑ، دو کروڑ روپیہ سالانہ امداد دے تو ان صوبوں کا خرچ پورا ہو۔ سندھ اور سرحد کے صوبے علیحدہ قائم ہو چکے ہیں اور وہ مرکزی حکومت کی امداد کے بغیر کام چلا نہیں سکتے۔ بلوچستان بھی اسی کیفیت کا حامل ہوگا۔

چھوٹے صوبوں کی بے بسی

ان حالات میں چھوٹے صوبوں کی حکومتیں بالکل بے بس ہیں۔ انہیں اپنا کام چلانے کے لئے مرکز کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ان سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ مرکزی حکومت کی منشا کے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں۔۔۔ پس یہ تینوں صوبے مرکز کے رحم پر ہونگے۔ اور مرکز میں ہمیشہ ہندو اکثریت ہوتی۔ اگر مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں ملتیں

بڑے صوبوں کا حشر

اس طرح لے دے کر دو بڑے صوبے بنگال اور پنجاب ہی رہ جاتے ہیں جو اپنا خرچ خود برداشت کر سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان دونوں صوبوں کے جھگڑے ختم ہونے میں نہیں آتے۔ ہندوؤں نے بنگال میں اور ہندو سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کو ادنےٰ حیثیت میں دیکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

اسی لئے ہندوؤں اور سکھوں نے پنجاب اور بنگال کا جھگڑا ختم نہ ہونے دیا۔ اور اپنی تنگ نظرانہ مطلب پرستی کی بدولت مسلمانوں کے ذہن کو زیادہ منتشر اور خوفزدہ کرتے گئے

(۱۲)

کانگرس کی مجلس عاملہ کا فارمولا اور مجلس احرار کا اعلان

۱۹۳۱ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک اور کوشش کی کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے بارے میں کوئی تازہ سمجھوتہ ہو سکے۔ اب کے اس نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کیں تجاویز اور ان کے متعلق مجلس احرار کا اعلان اس بیان میں درج ہے۔ جو مجلس احرار کی طرف سے مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی نے ۲۲ر جولائی ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے بعد شائع کیا۔ چونکہ اس بیان میں کانگرس کی مجلس عاملہ کی قرارداد مفاہمت بھی تمام وکمال درج ہے۔ اس لئے میں اس بیان کو بلا تنقید پیش کرنے پر ہی کفایت کرتا ہوں

مولانا داؤد غزنوی کا بیان

آل انڈیا نیشنل کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق جو حل تجویز کیا ہے۔ اُس پر غور و فکر کے لئے احرار اسلام پنجاب کی مجلس عاملہ کا ایک نہایت اہم

اجلاس ۲۲ر جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے زیر صدارت منعقد ہؤا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ چودہری افضل حق صاحب۔ شیخ حسام الدین صاحب۔ مولانا احمد علی صاحب۔ مولانا مظہر علی صاحب۔ ڈاکٹر عبد القوی صاحب اور راقم الحروف شریک جلسہ ہوئے۔ طویل غور و فکر کے بعد مجلس عاملہ اس نتیجہ پر پہنچی۔ کہ کانگرس کی قرارداد مفاہمت غیر تسلّی بخش اور ناقابل قبول ہے۔ جماعت احرار کی مجلس عاملہ نے کانگرس فارمولا کی مختلف دفعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اعتراضات کئے ہیں اُنہیں پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ کانگرس کی قرارداد مفاہمت لکھ دی جائے۔ تاکہ ناظرین کانگرس فارمولا اور ہمارے بیان دونوں کو سامنے رکھکر آسانی سے حقیقت نفس الامری معلوم کرسکیں۔

کانگرس کی قرارداد مفاہمت

۱۔ (الف) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کے سلسلہ میں جو دفعات ہونگی۔ اُن میں مختلف قوموں کو اُن کی تہذیب و تمدّن۔ زبان۔ رسم الخط۔ تعلیم۔ پیشوں۔ مذہبی اعمال اور مذہبی اوقاف کے متعلق اطمینان دلایا جائے گا۔

(ب) شخصی قوانین (پرسنل لاء) کا تحفظ دستور اساسی میں ایک خاص دفعہ کے ذریعہ کر دیا جائے گا۔

(ج) مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کا تحفّظ مرکزی حکومت کے ذمہ اور اُس کے حیطہ اقتدار میں ہوگا۔

۲۔ تمام بالغوں کو حق رائے دہی حاصل ہوگا جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے۔

(تشریح) کانگرس کی مجلس عاملہ، کراچی کانگرس کی ایک قرارداد کے مطابق بالغوں کے حق رائے دہی کی پابند ہے۔ اور اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس خیال سے کہ بعض حلقوں میں اس کے متعلق شک ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کو صاف کرنے کی غرض سے مجلس عاملہ یہ بتا دینا چاہتی ہے۔ کہ جس وقت بھی معیار رائے دہی میں توسیع کی جائے گی۔ اُس وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا۔ کہ یہ توسیع دو چیزوں کو لئے ہوئے ہو۔ ایک تو یہ کہ معیار رائے ہی تمام فرقوں کے لئے ساوی ہو۔ اور دوسری یہ کہ ہر فرقہ کی آبادی کے تناسب اُس کے رائے دہندوں کی فہرست مرتب ہو۔

۳۔ (الف) ہندوستان کے آیندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب نمایندگی کی اساس اور بنیاد ہو گا۔

(ب) ہندوؤں کے لئے سندھ میں، مسلمانوں کے لئے آسام میں، سکھوں کے لئے پنجاب اور صوبہ سرحد میں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ہر اُس صوبہ میں جہاں ان کی تعداد ۲۵ فی صدی سے کم ہو۔ ہندوستان کی مرکزی مجلس اور اسی طرح صوبہ جاتی مجالس قانون ساز میں آبادی کے تناسب سے اُن کے لئے نشستیں محفوظ ہونگی اور اُنہیں علاوہ محفوظ نشستوں کے باقی ماندہ نشستوں میں بھی عام انتخاب کے وقت مقابلہ کرنے کا حق ہو گا۔

۴۔ ملازمتیں ایک غیر جانبدار پبلک سروس کمیشن کے سپرد کر دی جائیں گی۔ جو قابلیت کا ایک کم سے کم معیار مقرر کرے گا۔ اور تمام فرقوں کو ملک کی ملازمتوں میں منصفانہ حصّہ حاصل کرنے کے مساوی مواقع دلائے گا۔

۵۔ مرکزی اور صوبہ جاتی وزارتوں کی ترتیب و تشکیل میں کنونشن (مختلف

پارٹیوں کے لیڈرز کے ساتھ وزیر اعظم کی مجلس مشاورت وزارتوں کے مرتب کرنے کے لئے) کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق کی نمایندگی ہؤا کرے گی۔

۶۔ صوبۂ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئین حکومت حاصل ہوگا

۷۔ سندھ کو اس شرط پر علیحدہ صوبہ بنایا جائے گا۔ کہ وہاں کے باشندے علیحدہ صوبہ کے مصارف برداشت کرنے کو تیار رہوں۔

۸۔ ملک کا آیندہ دستور اساسی ترکیبی (فیڈرل) ہوگا۔ اور باقی ماندہ یا مصرحہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہونگے۔ سوائے اس کے کہ مزید تجربہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ صورت ملک کے بہترین مفاد کے خلاف ہے۔

جماعت احرار کا بیان

کانگرس فارمولا پیش کر دینے کے بعد اب جماعت احرار کا وہ اعلان درج کیا جاتا ہے۔ جو اس فارمولا کی مختلف دفعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شائع کیا گیا ہے:۔

۱۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے یہ تو مان لیا ہے کہ ہندوستان کا آیندہ دستور ترکیبی (فیڈرل) ہو۔ لیکن اقلیتوں کے مسائل کو براہِ راست مرکزی حکومت کے ماتحت رکھ کر اس نظام ترکیبی کی حقیقی حیثیت بالکل بدل ڈالی ہے۔ باقیماندہ اختیارات بھی مشروط طریقہ پر صوبوں کے حوالے کئے گئے ہیں۔ اور لکھ دیا گیا ہے۔ کہ اگر مزید تحقیق پر ضرورت سمجھی گئی۔ تو انہیں مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ گویا مجوزہ دستور اگرچہ بظاہر فیڈرل ہوگا۔ لیکن حقیقتاً باعتبار عمل اُسے یونٹری سمجھا جائے گا۔ سارے اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہونگے۔ جہاں ہندوؤں کو ہمیشہ زبردست اکثریت حاصل رہے گی۔

۲۔ بالغوں کے حق رائے کو غیر اہم بنا دیا گیا ہے۔ اور نہرو رپورٹ کی طرح اُسے دستور اساسی کا بُنیادی پتھر نہیں سمجھا گیا۔ ایک متبادل سکیم بھی پیش کر دی گئی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ معیار رائے دہی سب کے لئے یکساں ہوگا۔ لیکن مختلف اقوام کے تناسب آبادی کو تناسب رائے دہندگان میں منعکس کیا جائیگا۔ اس متبادل سکیم سے بالغوں کے حق رائے کے مطالبہ کا سارا زور جاتا رہا۔ معہذا اس سکیم پر عمل کرنا بالکل غیر ممکن ہے۔ کوئی ایسا یکساں معیار رائے دہی تجویز نہیں کیا جا سکتا جس کے ذریعے سے آبادیوں کا تناسب ووٹروں کے تناسب میں منعکس ہو جائے۔

۳۔ کانگرس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوؤں کے لئے سندھ میں، مسلمانوں کے لئے آسام میں، سکھوں کے لئے پنجاب و سرحد میں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ہر اُس صوبے میں جہاں اُن کی آبادی ۲۵ فی صدی سے کم ہو، نشستیں آبادی کی بنا پر مخصوص کر دی جائیں گی۔ اور انہیں مزید نشستوں کے مقابلہ کا حاصل رہے گا۔ یہ تجویز بالکل لغو ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پنجاب کے سوا ہندوستان کے ہر حصّہ میں نہرو رپورٹ والی صورت قائم رہے گی۔ نہرو رپورٹ کے ماتحت پنجاب کے لئے نشستیں مخصوص نہیں کی گئی تھیں۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے صاف صاف یہ نہیں کہا۔ کہ پنڈت مالویہ۔ مہاتما گاندھی اور اس وضع کے دوسرے اصحاب کے نظریات قبول کر کے پنجاب میں سکھّوں کے لئے مسلمانوں کے نقصان پر رعایت کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ کہ ہندوؤں کے لئے سندھ میں اور مسلمانوں کے لئے آسام میں نشستیں مخصوص ہونگی۔ گویا ایک نیا توازن قائم کیا جا رہا ہے۔ اور سکھّوں کو پنجاب میں جو کچھ دیا جا رہا ہے۔ وہ مسلمانانِ آسام کے معاوضہ میں دیا جا رہا ہے۔ مشہور سکھ لیڈر گیانی

شیر سنگھ نے حال ہی میں جو اعلان شائع کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے گیانی صاحب کو بتایا۔ کہ پنجاب و سرحد میں دو انتخاب ہونگے۔ اوّلاً آبادی کی بنا پر سکھوں کی مخصوص نشستوں کے لئے علٰحدہ انتخاب ہوگا۔ جس میں ووٹروں کی حیثیت سے ہندو اور مسلمان بھی شریک ہونگے۔ لیکن امیدوار صرف سکھ کھڑے ہونگے۔ اس انتخاب کی تکمیل کے بعد عام انتخاب ہوگا۔ جس میں سکھ مزید نشستوں کے لئے مقابلہ کر سکیں گے۔ اور اپنی تعداد بڑھا سکیں گے۔ اس طرح سکھوں کو کونسل میں دو مرتبہ نمایندے بھیجنے کا موقع مل جائے گا۔ اور مسلمانوں کے لئے اپنی معمولی اور عددی اکثریت قائم رکھنے کا خفیف سا امکان بھی باقی نہیں رہے گا۔

۴۔ علیحدگی سندھ کو بدستور مشروط رکھا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر باشندگانِ سندھ خرچ برداشت کرنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا۔ کہ اگر سندھ کے ہندو زائد خرچ برداشت کرنے سے انکار کرینگے تو کیا ہوگا۔ نہ یہ بتایا گیا ہے کہ کون اس بات کا فیصلہ کرے گا۔ کہ اہلِ سندھ خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ یہ تجویز تو گول میز کانفرنس کی سندھ کمیٹی کی تجویز سے بھی پیچھے ہٹ گئی ہے۔ اس لئے کہ سندھ کمیٹی نے علیحدگی کا اصول تسلیم کر لیا تھا۔ صرف یہ شرط لگائی تھی۔ کہ علٰحدگی کی صورت میں خسارہ کا اندیشہ ہو تو نمایندگان سندھ کو اس خسارہ کے پورا ہو جانے کے متعلق اطمینان دلانے کا موقعہ دیا جائے۔

۵۔ مرکزی حکومت میں مسلمانوں کو برطانوی ہند کی نشستوں میں سے ⅓ حصہ نہیں دیا گیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے قول کے مطابق اس مسئلہ کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس فارمولا کے مطابق مسلمانوں کو وہ تناسب حاصل کرنے کا

موقعہ ہی نہ دیا جا سکے گا۔ جو انہیں اب حاصل ہے۔ اور مرکز میں ان کی پوزیشن بالکل کمزور ہو جائے گی۔

۶۔ پرسنل لاء وغیرہ کے متعلق جو تحفظات تجویز کئے گئے ہیں۔ وہ جمعیۃ العلماء ہند کے نزدیک غیر تسلی بخش ہیں۔ اور جمعیت اپنی رائے ظاہر کر چکی ہے۔

غرض کانگرس کی مجلس عاملہ کی سکیم گاندھی جی۔ ہندو مہا سبھا اور سکھ لیگ کے درمیان مفاہمت کے سوا کچھ نہیں۔ مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کو ان تجاویز پر رضامند کر لیا گیا ہے۔ جو مسلمانوں کے مطالبات کے مترادف نہیں۔ اور جن کے ذریعے سے ہندوؤں اور سکھوں کو مرکز میں اور تمام بڑے بڑے صوبوں میں عام اقتدار حاصل ہو جائیگا جس مسلمان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں۔ اور اس کا دل ہندوؤں کے پروپیگنڈے کی قوت سے متاثر نہ ہو۔ ان تجاویز کو قبول نہیں کر سکتا۔ جو ملتِ اسلامیہ کی سیاسی ہستی کو فنا کر دینے والی ہیں۔ (داؤد غزنوی جنرل سکرٹری مجلس استقبالیہ پنجاب احرار کانفرنس لاہور)

(۱۳)

گاندھی جی کا لندنی فارمولا

گول میز کانفرنس میں پہنچ کر مسلمانوں کی طرف سے نمایندگی کرنے کے لئے گاندھی جی کے پاس کوئی قابلِ قدر فارمولا نہ تھا۔ مُسلم نیشنلسٹ کانفرنس سے جلد بازی میں جو قرارداد منظور کرائی گئی تھی۔ وہ ایسی بھونڈی تھی کہ اس سے دستبردار ہوتے ہی بنی۔ البتہ اس کی بنیاد کو ذرا ترمیم کر کے کانگرس کی مجلس عاملہ نے اپنی وہ قرارداد مفاہمت پیش کی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس قرارداد سے نہ مولانا آزاد کلیتہً متفق تھے نہ جمعیۃ العلمأ اور نہ مجلس احرار۔

مگر گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے کسی نہ کسی شے کی ضرورت تھی۔ اس لئے کوئی نہ کوئی نیا اقدام چاہئے تھا۔ مجلس احرار اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی۔ اس سے کچھ توقع نہ رہی تھی۔

جمعیت العلماء کی مجلس عاملہ کا فیصلہ

البتہ اس مرحلے پر جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ نے سہارنپور میں اجلاس کر کے

مخلوط انتخاب کی ایک قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کی بنا کانگرس کی مجلس عاملہ کی اس قرارداد مفاہمت پر تھی جس کا سابقہ مضمون میں تذکرہ ہو چکا ہے۔

اس قرارداد کے متعلقہ حصّے میں کہا گیا تھا کہ اگر رائے دہندوں کی فہرستوں میں مسلم اور غیر مسلم فرقوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہو تو مخلوط انتخاب رائج کر دیا جائے۔

گاندھی جی کا طرزِ عمل

مجھے یہاں جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کی قرارداد سے اس قدر بحث نہیں جس قدر گاندھی جی کے طرزِ عمل سے ہے۔ جمعیۃ العلماء کے بزرگ آئینی پیچیدگیوں اور اعداد و شمار کے جھمیلوں سے کب آشنا تھے کہ انہیں آیندہ مشکلات پر عبور ہوتا۔ وہ تو اس بات کی تمنّا میں تھے کہ مخلوط انتخاب قائم ہو جائے۔ اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے ہو۔

مگر نہ اُنہوں نے اور نہ گاندھی جی نے خیال کیا۔ کہ آبادی کے تناسب سے رائے دہندگان کے تناسب کو وابستہ کرنا دانائی نہیں۔ اور وہ یہ خیال بھی کیسے کرتے جبکہ کانگرس کی مجلس عاملہ ہی اس اصول پر مہر تصدیق ثبت کر چکی تھی۔

پہلی قباحت

اس فارمولا میں پہلی قباحت تو یہ تھی کہ جب دولت اور تعلیم وغیرہ کی بنا پر حق رائے دہی مرتب کیا جائے تو دولت مند اور تعلیم یافتہ قوم کے ووٹ زیادہ ہونگے۔ اور مفلس اور ناتعلیم یافتہ قوم کے ووٹ کم ہونگے۔ اس لئے پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب کے مطابق رائے دہندوں کا تناسب کیسے ہوگا۔ اور سرحد یا سندھ وغیرہ میں بھی یہ کیفیت کیسے پیدا ہو سکے گی۔ اس منطق کی پیروی کرنا تو اس منطقی کے نقش قدم پر چلنا ہے جو دریا سے پار اُترنا چاہتا تھا۔ اور اس نے سردیوں کے موسم میں کنارے پر کھڑے

ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ کنارے کے پاس کتنا پانی ہے۔ اور آگے کتنا ہے۔ درمیان میں کتنا ہے۔ اور پرے کنارے پر کتنا ہے۔ تو انہوں نے ایک فٹ۔ ۳ فٹ۔ ۸ فٹ ۳ فٹ اور ایک فٹ بتایا۔ تو منطقی مہندس نے حساب لگایا کہ گہرائی کی اوسط تو ۳ فٹ ہی ہوتی ہے۔ اس لئے خوشی سے دریا کو پیدل پار کرنا چاہئے۔ لیکن کاغذ پر اوسط تو ٹھیک تھی۔ دریا کے درمیان اوسط اوسط ٹھیک نہ تھی۔ اس لئے ہمارے منطقی مہندس پانی میں بہ گئے۔ اور اپنے ساتھ ہی اپنی منطق اور ہندسے کو بھی بہا لے گئے۔ یہی حال اس منطق کا ہے۔ جسے کانگریس کی مجلس عاملہ نے پیش کیا اور جمعیتہ العلماء کی مجلس عاملہ نے منظور کیا۔ نہ کوئی معیار حق رائے ایسا ہوگا جس سے رائے دہندوں کا تناسب آبادیوں کے تناسب کے برابر ہو اور نہ کبھی کوئی ایسی فہرست تیار ہو سکے گی جس پر عملدرآمد کیا جا سکے بالخصوص جب یہ طے شدہ امر ہو کہ حق رائے دہی کا معیار بہر حال مساوی ہوگا۔ جیسا کہ کانگریس کی قرارداد مفاہمت میں کہا گیا تھا۔

دوسری قباحت

اس فارمولے کی دوسری قباحت یہ تھی کہ ہر صوبے میں اس کے حالات کے مطابق رائے دہی کے معیار اس خیال سے قائم کئے جائیں۔ کہ رائے دہندوں کا تناسب آبادیوں کے تناسب کے مطابق ہو۔ اور فہرستیں بنائی جائیں۔ فہرستوں میں تناسب درست نہ آئے تو پھر نئے معیار رائے دہندگی سوچے جائیں۔ پھر دوبارہ فہرستیں تیار ہوں۔ اور پھر خرابی در پیش آئے۔ غرض وہی بات بار بار دہرائی جائے۔ اور ہر انتخاب محض اس لئے ملتوی ہوتا رہے کہ سال بہ سال مناسب فہرست تیار نہیں ہو سکی جس میں فرقوں کا تناسب درست ہو۔

تیسری قباحت

اس فارمولے کی تیسری قباحت یہ تھی کہ اگر کبھی جان مار کر اور دماغ لڑا کر کوئی فارمولا

ایسا کُل بھی آئے جس سے تناسب درست ہو جائے تو بھی انتخاب کے نتائج لازماً درست نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ۹۔ اور ۱۱ میں وہی تناسب ہے جو ۴۵ اور ۵۵ میں ہے یا ۹۰ اور ۱۱۰ میں ہے۔ یا ۴۵۰ اور ۵۵۰ میں ہے یا ۴۵۰۰ اور ۵۵۰۰ میں ہے۔ یا ۲۲۵۰۰ اور ۲۷۵۰۰ میں ہے انتخاب کی باریکیوں پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اگر ایک حلقہ انتخاب میں ۲۷۵۰۰ مسلم اور ۲۲۵۰۰ غیر مسلم ووٹ ہوں۔ تو الیکشن کی کیا صورت ہوگی۔ اور اگر اس میں ۵۵۰ اور ۴۵۰ ووٹ بالترتیب ہوں تو اثر کیا ہوگا۔ اور محض ۱۱ اور ۹ ووٹ رہ جائیں تو نتیجہ کیا نکلے گا۔ یقیناً پہلی صورت سے دوسری صورت اور دوسری صورت سے تیسری صورت مسلم انتخابی جدوجہد کے لئے تکلیف کا باعث ہوگی۔ تیسری صورت میں دو مسلم ووٹروں کو اپنا ہمنوا بنانا غیر مسلموں کے لئے کافی ہوگا۔ اور دوسری صورت میں ۵۱ ووٹروں کو اور پہلی صورت میں ۲۵۰۱ ووٹروں کو۔ اس لئے محض ووٹوں کا تناسب ہر حال میں یکساں نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔

اہم ترین قباحت

لیکن اس فارمولے کی سب سے اہم قباحت یہ تھی کہ جس وقت ۱۹۲۸ء میں مسٹر جناح مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے۔ کہ اگر حق رائے دہی بالغاں کا اجرا حکومت پسند نہ کرے۔ تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آبادی کے لحاظ سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ تو اس وقت گاندھی جی اس بات کا تصور بھی ذہن میں لانے کے خلاف تھے۔ کہ حق رائے دہی بالغان کے علاوہ کوئی اور معیار رائے دہی ہو اور وہ فرماتے تھے۔ کہ میں کسی متبادل صورت کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

یہ فقرہ ۱۹۲۸ء کی آخری راتوں میں سے ایک رات خود میں نے سُنا اور میں

تقریباً ساری رات گفت گو کو سنتا رہا۔ اور یہ فقرہ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجا کیا ہے۔ لیکن جب گاندھی جی نے اس کے علاوہ دوسرے فارمولے کو لے کر لندن کا سفر گوارا کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

کلکتہ میں تتبادل صورت کے تصوّر سے انکار کرنا اور لندن میں متبادل صورت جیب میں ڈال کر ساتھ لے جانا حق رائے دہی بالغان اور فرقہ وارانہ فیصلے کی اُمیدوں کو تباہ کرنا تھا۔ جب لندن والوں کو پہلے سے پتہ ہو۔ کہ گاندھی جی متبادل صورت جیب میں لا رہے ہیں۔ تو وہ اصل مطالبے پر کب کان دھر سکتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے لندن میں جو کچھ کیا وہ کیا۔ وہ داستان کس سے پوشیدہ ہے۔

(۱۴)

وزیر اعظم برطانیہ کی ثالثی

لندن کی دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شرکت کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ کرسکی۔ اگر کسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو وہ فرقہ وارانہ فیصلے کی تھی۔ اور اگر حکومت نے گاندھی جی کو جیل سے نکال کر لندن پہنچایا تھا۔ تو اس لئے نہیں کہ وہ آپ کو قیدی سے مہمان بنا کر ان کی عمدہ تواضع کرنا چاہتی تھی۔ اور ہندوستان کا وہ متاعِ آزادی جو وہ اپنے نمک خوارانِ ازلی کو عطا کرنے پر آمادہ نہ تھی اسے گاندھی جی کے "نافرمانبردار" ہاتھوں میں سونپنے کو ترس رہی تھی۔

گاندھی جی کو لندن بُلانے کا مقصد

میں ان دنوں جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھا سوچا کرتا تھا کہ آخر حکومت نے گاندھی جی کو لندن کیوں بلایا ہے۔ جیل جانے سے پہلے بھی یہی خیال دامن گیر رہتا تھا اور مجھے تو یقین تھا

تھا کہ لنڈن کی اس نئی کانفرنس کا کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ البتہ حکومت برطانیہ اس سارے کھیل تماشے سے یہ فائدہ ضرور حاصل کرے گی۔ کہ وہ لنڈن کے تھیٹر سے دنیا کو نظارہ کرادے۔ کہ برطانیہ تو ہندوستانیوں کے اندرونی جھگڑوں کو چکانے کی فکر میں ہے۔ لیکن ہندوستانی خود کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔

پہلی گول میز کانفرنس میں اور لوگ تو تھے مگر روز روز کے جیلوں میں جانے والے نہ تھے۔ اب کے اُنہوں نے ہندوستانی قوم پسندوں کے رہنما اور کانگرس کے واحد نمائندے کو بلا کر ثابت کر دیا کہ لنگوٹی بند مہاتما کے ہاتھوں میں کوئی مداری کی چھڑی نہیں ہے۔ جس سے وہ سب ہندوستانیوں کو ایک ہی ناچ نچا سکے۔

غرض یورپ اور امریکہ میں لنڈن کے ایوانوں سے برطانوی سیاسی تمول اور ہندوستانی سیاسی دیوالیہ پن کا دلچسپ مظاہرہ ہو گیا۔

فقط ایک نکتہ

مجھے ان گفتگوؤں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لنڈن میں ہوئیں اور ناکام رہیں، مجھے فقط ایک نکتہ بیان کرنا ہے جو اس ساری داستان کا خلاصہ ہے۔ پنجاب کے بارے میں فرقہ دارانہ نیابت کے سمجھوتے کی کوشش ہوئی اور وہ اصل مقام تک پہنچ گئی۔ کہ اگر سکھوں کو ایک اور نشست دیدی جائے۔ تو راضی نامہ ہو جائے مگر سکھوں کی طرف سے یہ اصرار ہوا کہ یہ نشست مسلمانوں سے لے کر دی جائے کسی اور سے لے کر نہ دی جائے۔ حالانکہ کیفیت یہ تھی کہ غیر مسلم نشستوں میں سے ایک نشست سکھوں کے حوالے کر کے جھگڑا چکانے کی صورت کی جا رہی تھی۔ تاکہ مسلمانوں کو بھی ناراضی نہ ہو۔ اور سکھوں کو بھی مطلوبہ نشست مل جائے لیکن سکھوں کے نمائندے نے اصرار کیا کہ ہم یہ مزید نشست

مسلمانوں ہی سے لیں گے۔ غیر مسلموں سے نہیں۔

گویا سکھوں کا منشا اپنی نشستوں کو بڑھانا نہ تھا بلکہ مسلمانوں کی نشستوں اور ان کے تناسب کو گھٹانا تھا۔ یہ وہ بات تھی جسے مسلمان نمایندے قبول کرنے کو تیار نہ تھے اس لئے فرقہ وارانہ فیصلے اور مخلوط انتخاب کے رواج کی ایک اور گنجائش مٹی میں مل گئی۔

اب فقط ایک ہی صورت تھی کہ برطانوی حکومت خود ہی کوئی فیصلہ صادر کرے۔ جس کے مطابق ہندوستان کا آئین تیار کیا جائے۔ یہ کام مسٹر رامزے میکڈانلڈ کے سپرد ہوا۔ اور وہ فریقین کی باہمی رضامندی کے بغیر ہی ثالث مقرر ہوئے۔

ہم ان کی ثالثی کے فیصلے کے بارے میں آیندہ مضمون میں بحث کرینگے۔ اس مضمون میں فقط یہ دکھانا مقصود ہے کہ ان کے فیصلے کے اعلان سے پہلے ہندوستان میں کیا صورت حال رہی۔

اپنا اپنا راگ

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر کسی نے اپنا اپنا نقطہ نگاہ پیش کرتا اور اپنا اپنا راگ الاپتا تھا ہر کوئی اپنے اپنے حقوق جتاتا اور اپنے مطالبات کو حق بجانب ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا تھا۔

مسلم کانفرنس کی کارروائی

۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس نے ایک قرارداد میں کہا کہ

"ہر گاہ کہ مسلم قوم گزشتہ دو گول میز کانفرنسوں کی کارروائی سے خوش نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کے وہ مطالبات جو یکم جنوری ۱۹۲۹ء اور ۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو مرتب کئے گئے ہیں منظور نہیں کئے گئے۔ اور

ہرگاہ کہ اس کانفرنس میں رائے عامہ یہی ہے کہ چونکہ اس کی تعاونی حکمت عملی تاحال تسلّی بخش نتائج پیدا نہیں کر سکی۔ اس لئے یہ کانفرنس فیصلہ کرتی ہے۔ کہ اب مسلمانوں کے لئے گول میز کانفرنس اور اس کی ان ماتحت کمیٹیوں سے تعاون کرنا خارج از امکان ہے جو آئین مرتب کر رہی ہیں۔ اور یہ تعاون اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ فیصلہ نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات اس آئین میں شامل کئے جائیں گے۔"

مسلم رہنماؤں کا اعلان

اپنے مطالبات کی تائید میں مسلم رہنماؤں نے ۵ رجون ۱۹۳۲ء کو ایک اعلان جاری کیا جس میں اپنے مطالبات کی تائید میں اور باتوں کے علاوہ یہ دلائل دئے :۔

(۱) ہندوستانی فوج میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد مسلمان آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ جنگ عظیم میں مسلمانوں نے شہنشاہ معظم کی بھرتی کی دعوت کا شاندار جواب دیا۔ اور مسلمان سپاہی بڑی سے بڑی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جرمن دشمنوں کے علاوہ اپنے ان ہم مذہبوں سے بھی لڑتے جن کے ساتھ ان کو یگانگت تھی۔

انگریزوں نے اکثر دفعہ کہا ہے کہ جنگ عظیم میں پنجاب کا اتنا خون بہا کہ وہ سفید ہو گیا۔ اور پنجاب کی فوج کی غالب اکثریت مسلمان تھی۔ اسی طرح صوبہ سرحد۔ سرحدات ہند اور بلوچستان کی پولیس ملیشیا اور فرنٹیر کانسٹیبولیری کی نمایاں اکثریت مسلمان ہے جسے ہمیشہ اپنے ہی اعزو اقارب سے جنگ کرنا پڑی ہے۔

(۲) مسلمانوں نے ۱۹۳۰ء کی کانگرس کی مہم میں بہت کم حصّہ لیا۔ سوائے صوبہ سرحد کے جہاں کہ سرخ پوشوں نے دھوکے میں آکر کانگرس کے جھنڈے کو قبول کیا اور وہ تحریک جاری کی جس کا کانگرس سے تعلق نہ تھا۔ مگر جس میں اب انصاف کو کانگرس کی

سازش پر فتح نصیب ہو چکی ہے۔ کانگرس کی موجودہ مہم میں مسلمان ایک سے زیادہ مواقع پر بغاوت پسندوں کے خلاف عداوت کا اظہار کر چکے ہیں۔ اور پہلے سے بہت کم مسلمان ظاہرہ طور پر کانگرس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

محض اسی بنا پر حقوق طلب کرنا شاید نامناسب معلوم ہو۔ لیکن ہم اپنی طرف سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان کانگرس کی سیاست سے اس لئے نہیں علیحدہ رہا کئے کہ اس سے ان کو فائدہ حاصل ہو گا۔ کیونکہ تلخ تجربہ ہمیں اس کے خلاف سبق دیتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ انہیں موجودہ نظامِ حکومت کی بجائے ہندو کانگرس کی مطلق العنانی قائم ہونے سے بھی کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اور انہیں یقین ہے کہ کانگرس کی سیاست ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یکساں اقتصادی تباہی کا باعث ہو گی۔

(۳) گورنروں کے صوبوں میں گزشتہ دو سال میں یا اس سے کچھ زیادہ عرصے میں جو سیاسی قتل ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی بھی کسی مسلمان نے نہیں کیا۔ لاہور میں مسٹر سانڈرس اور چانن سنگھ کے تینوں قاتل ہندو تھے۔ مسٹر لوبین۔ کرنل سمپسن۔ مسٹر گاریک۔ مسٹر سٹونسن۔ مسٹر پیڈی اور مسٹر ڈگلس کے قاتل بھی ہندو ہی تھے۔ اسی طرح پنجاب۔ بمبئی اور بنگال کے گورنروں پر اور مسٹر وبلیرز۔ مسٹر کاسلز اور سر چارلس ٹگارٹ پر حملہ کرنے والے بھی ہندو ہی تھے۔ لارڈ ارون کی جان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں مسٹر پیڈی کے قتل اور بے شمار جرائم میں سب کے سب مشتبہ لوگ ہندو تھے۔ چاٹگام میں اسلحہ خانے پر حملہ کرنے والے اور خان بہادر احسان اللہ کے قاتل بھی ہندو تھے۔

۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۷ء کی سیاسی تحریک اور جرائم کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی جب کہ مسلمانوں کے جذبات ایک سے زیادہ مرتبہ انگریزوں کے

خلاف بھڑکائے گئے تھے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک تیس کا تھا ہمیں یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ کسی مسلمان اخبار نے بھی گزشتہ دو برس میں کسی سیاسی قاتل کے ساتھ ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہا ہو۔ حالانکہ ہندو کانگریسی اخباروں نے کئی مہینوں تک ایسے سیاسی مجرموں کی قصیدہ خوانی کی۔

سر آغا خاں کی ترمیم

ہز ہائی نس سر آغا خاں نے جب مسلمان لیڈروں کے اس اعلان کو دیکھا تو انہوں نے ہندوؤں کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بہت ترامیم کر کے اسے ۱۱ جون کے "ٹائمز" اخبار لندن میں چھپوایا۔

قوم پرور مسلمانوں کا اعلان

قوم پرور مسلمانوں نے ان اعلانوں کے جواب میں ایک اعلان شائع کیا جس میں اپنا نقطہ نگاہ تفصیل سے پیش کیا گیا۔ اس میں صوبہ سرحد اور دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں قربانیوں کا ذکر کیا گیا۔ اور انہیں خوب سراہا گیا۔ ہندوستان کے آئینی مسائل کا ذکر بھی کیا گیا۔ مگر فرقہ وارانہ فیصلے کے سلسلے میں یہ کہنا پڑا کہ:-

"باہمی گالی گلوچ کا ارزاں سبب یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوا۔ لیکن ہم ان لوگوں کو مطلع کرتے ہیں جنہیں اب تک علم نہیں۔ کہ جمعیۃ العلماء ہند اور مسلم نیشنلسٹوں نے اور کانگریس نے چند فارمولے تیار کئے تھے۔ جن کو اگر باہم ربط دیا جاتا تو مختلف فریقوں کے درمیان مفاہمت ہو جاتی۔ لیکن اس سے پہلے گاندھی جی کو یکایک لندن جانا پڑا۔ اور ان کے آنے کے فوراً بعد انہیں اور دوسرے آزاد خیال رہنماؤں کو جیل میں جانا پڑا......"

ہندو واضعین قانون کا اعلان

یکم اپریل کو مسٹر کھاپرڈے۔ مسٹر جگدیش چندر۔ بنیرجی۔ رائے بہادر رام سرنداس اور دوسرے ہندو لیڈروں نے جو مرکزی اسمبلی اور کونسل کے رکن تھے۔ مسلم کانفرنس کے مطالبات کی مخالفت میں ایک اعلان جاری کیا جس میں مخلوط انتخاب پر زور دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ ہندو اور سکھ ہمیشہ مخلوط انتخاب کی تائید کرتے آئے ہیں۔ اور مخلوط انتخاب کے بغیر جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی۔

انہوں نے برطانوی وزیر اعظم کو اس کی جنوری ۱۹۳۱ء کی تقریر بھی یاد دلائی۔ جس میں اس نے جداگانہ انتخاب اور اس کے سب شگوفوں کی سخت مذمت کی تھی۔

اُنہوں نے اپنے اجلاس میں کچھ قراردادیں بھی منظور کیں۔ جن میں سے ایک میں کہا گیا تھا۔ اگر حکومت نے مسلمانوں کے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ وہ ہندوؤں کے حقوق سلب کر رہی ہے۔ اور اس حالت میں تمام ہندو اور سکھ قوم پرست سخت ترین مزاحمت کریں گے۔

ایک اور قرارداد میں کہا گیا۔ کہ حکومت نے صوبہ سرحد کو ایک کروڑ روپیہ کی امداد کا فیصلہ غیر آئینی طریقہ پر کیا ہے۔

ایک اور قرارداد میں کہا گیا۔ کہ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے فرقہ وارانہ تناسب کی بنا پر ملازمتوں میں بھرتی کرنا قابلِ مذمت ہے۔ اور مطالبہ کیا گیا کہ کھلا مقابلہ ہونا چاہئیے

بنگال کے ہندوؤں کا اعلان

بنگال کی ہندو سبھا نے خاص کر بنگال کے متعلق مُسلم مطالبات کی تردید کی۔ اس نے اور باتوں کے علاوہ کہا۔ کہ :۔

(۱) بنگال کے مسلمانوں نے اور صوبوں کے مسلمانوں کی طرح کبھی فوج میں بھرتی نہیں ی

(۲) ہندو قوم جو تعلیم کی فراوانی۔ سیاسی قابلیت۔ شہری اور سیاسی اداروں کی ترقی اور ہر شعبہ میں حکومت کی ہمیشہ خدمت کرتے چلے آئے ہیں مسلمانوں سے فائق ہے اور خوب کارہائے نمایاں دکھا چکی ہے۔

(۳) ادب۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ میں بنگالی ہندو سارے ہندوستان سے بڑھ کر ہیں۔ اور بنگال کے مسلمان ابھی تک ایک ایسا شخص بھی پیدا نہیں کر سکے جو سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا ہو۔

(۴) آبادی کے لحاظ سے ان کا زیادہ حصّہ مانگنا بھی فضول ہے۔ کیونکہ اوّل تو بنگالی بولنے والے کئی ضلعے دوسرے صوبوں میں شامل ہیں۔ جن میں ہندو آبادی کی اکثریت ہے۔ دوسرے بنگال میں مسلم اکثریت بھی نام نہاد ہے۔ کیونکہ یہ اکثریت نابالغ بچوں اور پردہ نشین عورتوں پر مشتمل ہے۔ جو پردہ میں رہنے کے باعث قومی زندگی میں کوئی حصّہ نہیں لیتیں۔ جہاں تک بالغ آبادی کا تعلق ہے۔ ہندو اکثریت میں ہے۔ (بنگال کے ہندوؤں کا یہ دعوٰے ظاہر کرتا ہے کہ کانگرس اور جمعیت العلماء کے وہ فارمولے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور جن میں کہا گیا تھا۔ کہ آبادی کا تناسب رائے دہندوں کی فہرستوں میں قائم کیا جائے۔ کس قدر بیکار ہیں۔ کیونکہ اگر حق رائے دہی بالغان سے بھی وہ تناسب پیدا نہ ہو سکے۔ تو اور کس یکساں حق رائے سے ایسا ہو سکتا ہے)

(۵) وہی تناسب جو لکھنؤ کے میثاق میں قائم کیا گیا تھا اب بھی قائم رہنا چاہیئے یعنی مسلمانوں کو چالیس فی صدی نشستیں ملنی چاہئیں۔

آل انڈیا ہندو نوجوان کانفرنس

ہندو نوجوان کانفرنس مئی ۱۹۳۲ء کے دوسرے ہفتے کے شروع میں کراچی میں ہوئی۔ جس میں کانفرنس کے صدر بھائی پرمانند نے مسلم کانفرنس کے مطالبات کے خلاف بہت کچھ کہا۔ اس کانفرنس میں زیادہ تر توجہ سندھ کی علیحدگی کے مسئلہ پر دی گئی۔ ایک قرارداد میں اور باتوں کے علاوہ کہا گیا۔ کہ حکومت نے یہ اعلان کرنے میں غلطی کی ہے کہ اگر سندھ کے صوبہ کی مالیات کا بندوبست تسلی بخش ہوگیا۔ تو صوبہ کو علیحدہ کردیا جائیگا اور حکومت کو یاد دلایا گیا کہ یہ اعلان اس قرارداد سے تجاوز کرتا ہے۔ جو گول میز کانفرنس میں منظور کی گئی تھی۔ کیونکہ سندھ کمیٹی کے چیئرمین نے تو کہا تھا کہ اگر سندھ اپنا خرچ خود برداشت نہ کرسکا تو علیحدگی نہ ہوگی۔ تقریروں میں علیحدگی کی صورت میں فرقہ وارانہ کشمکش کی پیشینگوئی کی گئی۔ اور مسلمانوں کے بائیکاٹ کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔

سکھوں کے مطالبات

سکھوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۳۲ء کو اپنی پولیٹیکل کانفرنس میں جو قراردادیں منظور کیں۔ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) پنجاب میں سکھ قوم کی تاریخی۔ سیاسی اور اقتصادی اہمیت کے پیش نظر سکھ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز اور ملازمتوں میں ان کو ۳۰ فی صدی نمایندگی دی جائے۔ جیسے کہ مسلمانوں کو دوسرے صوبوں میں دی جارہی ہے۔

(۲) سکھوں کو مرکز میں پانچ فی صدی نمایندگی دی جائے۔

(۳) پنجاب کی وزارت میں سکھوں کو ایک تہائی حصہ دیا جائے۔ اگر کوئی فرقہ وارانہ سمجھوتہ نہ ہوسکے۔ تو پنجاب کی نئی ذمہ دار مرکزی حکومت اپنے دائرۂ انتظام

میں لے لے۔

(یہ مطالبہ بذاتِ خود ظاہر کرتا ہے۔ کہ پنجاب کا جھگڑا چکائے نہ جانے کی تہ میں ایک یہ تمنا بھی ہے کہ پنجاب کی حکومت مرکزی ہندوستان کی اکثریت والی حکومت کے سپرد ہو۔ اور یہاں مُسلم اکثریت کسی صورت اور انداز میں برسرِکار نظر نہ آئے)

پنجاب میں مختلف جگہوں پر خاص کر لاہور میں اجلاس کر کے سکھوں کی مختلف پارٹیوں نے حلف لیئے۔ کہ سکھ پنجاب میں مسلم اکثریت یعنی مُسلم راج کو ہرگز برداشت نہ کرینگے۔

(۱۵)

وزیر اعظم کا ثالثی فیصلہ

ان حالات میں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں، مسٹر رامزے میکڈانلڈ نے فرقہ وارانہ مسئلے کا عارضی فیصلہ اپنے ذمے لیا۔ تا کہ آئینی کارروائی معطل نہ ہو جائے۔ کیونکہ جب تک اسمبلیوں میں نشستوں کی تعداد اور جداگانہ یا مخلوط انتخاب کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک نئے نظام حکومت کا کوئی ڈھانچہ کیسے تیار کیا جا سکتا تھا۔

ہندوستان میں بھی مختلف فرقوں اور مذہبوں کے لوگ بار بار اصرار کر رہے تھے کہ فیصلہ جلدی ہو تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی کوششیں کہاں تک بار آور ہوئیں۔

پھر جداگانہ انتخاب

ہندوؤں نے عام طور پر جداگانہ انتخاب کے خلاف اس لئے کوشش جاری رکھی تھی اور مسلمانوں سے مخلوط انتخاب کے کسی فارمولے پر فیصلہ نہ کیا تھا کہ مسٹر رامزے میکڈانلڈ اور ان کے کئی ایک ساتھی ایسے ہیں جو بار بار جداگانہ انتخاب کے خلاف لکھ اور بول چکے ہیں

اس لئے ہم آپس میں کوئی بات طے کریں یا نہ کریں۔ وہ تو خود بخود مخلوط انتخاب رائج کر ہی دینگے۔ گول میز کانفرنس کے زمانے میں جو گفتگوئیں خلوت میں ہوئیں ان میں بھی وزیر اعظم اور ان کے ہمعصروں نے اپنی ذاتی رائے مخلوط انتخاب کے حق میں بیان کی ہوگی۔ اس لئے ہندو حلقوں میں مخلوط انتخاب کے رائج ہونے کی بہت کچھ اُمیدیں تھیں۔

وزیر اعظم کی معذرت

مگر وزیر اعظم برطانیہ نے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے ایک تمہیدی بیان میں کہدیا کہ "حکومت کے فیصلے کا درست ادراک کرنے کے لئے ان اصلی حالات کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن میں یہ فیصلہ صادر کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ بہت سالوں سے اقلیت کے فرقوں نے جداگانہ انتخاب کو اپنے حقوق و تحفظ کے لئے ضروری خیال کیا ہے اس لئے زمانہ حال کے آئینی استدراج کی ہر منزل میں جداگانہ انتخاب کو جگہ میّسر آتی رہی ہے۔ گو حکومت مخلوط انتخاب کے یکساں سلسلے کو کتنی ہی ترجیح کیوں نہ دیتی ہو۔ اس نے ان تحفظات کو منسوخ کرنا ناممکن پایا جن کو اقلیتیں ابھی تک بہت اہم سمجھتی ہیں۔ ان وجوہات پر بحث کرنا عبث ہے جن کی بدولت موجودہ حالات پیدا ہوئے۔ میں بڑی اور چھوٹی قوموں کو امن اور محبّت سے تعاون کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تحفّظ کی خاص خاص صورتوں کی مزید ضرورت نہ رہے۔ مگر اس اثنا میں حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھے اور نمایندگی کے اس خاص طریقے کو جاری رکھے۔"

مسٹر میکڈانلڈ کے ان الفاظ نے مخلوط انتخاب کی سب اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور جداگانہ انتخاب کی زبانی مخالفت کرنے والوں کو ایجی ٹیشن کا ایک نیا موقعہ ہاتھ آیا۔

بنگال میں نمایندگی

جداگانہ انتخاب کے علاوہ اس فیصلے میں مختلف صوبوں میں مختلف فرقوں کی نمایندگی

کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ بنگال اور پنجاب کے صوبوں میں ہی کش مکش زیادہ تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کرتے آئے ہیں۔

بنگال میں مسلمان اکثریت کے طلبگار تھے۔ مگر وہاں کے ہندو انہیں اکثریت دینے کے حق میں نہ تھے۔ بنگال اور پنجاب میں ہندوؤں یا سکھوں کی پوزیشن یہ تھی۔ کہ مسلمانوں کو اکثریت میں نہ ہونے دیا جائے۔

بنگال کی کل ۲۵۰ نشستوں میں سے کچھ جداگانہ انتخاب اور کچھ مخلوط انتخاب سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب سے ۱۱۹ نشستیں دی گئیں۔ اور اس طرح وہ اقلیت میں رہے۔ اگر انہیں چھ نشستیں اور ملتیں تو وہ نصف تعداد میں ہوتے اور کم از کم سات نشستیں اور ملتیں تو وہ ایک رائے کی اکثریت کے مالک ہوتے۔

بنگال میں یورپین راج

لوگ تو مسلمانوں کو ایک زائد نشست ملنے کو بھی مسلم راج کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ بنگال میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب سے ۱۱۹ نشستیں ہاتھ آئیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کے لئے پانچ اور مزدوروں کے لئے آٹھ نشستیں مخلوط انتخاب سے مقرر کی گئیں۔ جن میں سے کچھ نہ کچھ نشستیں مسلمانوں کو مل سکنے کی اُمید ہو سکتی تھی خواہ وہ ان میں سے چھ یا سات نہ بھی حاصل کر سکیں۔

مگر حکومت نے ہندوؤں اور اچھوتوں کے لئے ۸۰ نشستیں مخصوص کیں۔ ہندوستانی عیسائیوں کے لئے ۲۔ اینگلو انڈینوں کے لئے ۴۔ اور یورپینوں کے لئے ۱۱۔ اور ان کے علاوہ مخلوط انتخاب سے ۱۹ نشستیں تجارت وغیرہ کے لئے مخصوص کی گئیں۔ جن میں سے

۱۴ نشستیں یورپینوں کے قبضے میں آنے والی تھیں۔ اس طرح یورپین ۲۵ نشستیں حاصل کر گئے۔ اور ان کے علاوہ ۴۔ اینگلو انڈین ان کے ہمنوا ہو سکتے تھے۔ ۲ ہندوستانی عیسائی بھی ان سے بہت زیادہ دُور نہ جا سکتے تھے۔ بہر حال ہندوستانی عیسائی اور اینگلو انڈین جو چاہیں سو کریں۔ ۲۵ یورپین بذاتِ خود وہ پاسنگ قائم کر سکتے تھے جو بنگال میں صوبجاتی وزارت کو برسراقتدار رکھنے یا نہ رکھنے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قطعی فیصلہ کر سکے۔ اگر یورپین ارکان مسلمانوں کے ساتھ ہوں تو مسلمان اپنی مرضی کے مطابق حکومت بنا سکیں۔ اور چلا سکیں۔ اور اگر وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں تو وہ اپنی ترکیب اڑا سکیں۔

لیکن جو صورت بھی ہو، جب تک ہندو اور مسلمان خود آپس میں متفق و متحد نہ ہوں گے حکومت خود اختیاری کے اونٹ کی نکیل یورپینوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جدھر چاہیں اس کو پھرائیں۔ گویا ہندو مسلم مناقشے کے دوران میں بنگال کی وزارت یورپینوں کے رحم وکرم پر ہے۔

ہندوؤں کو اُمیدیں تھیں کہ وہ یورپینوں کو ساتھ لے کر بنگال میں اپنی مرضی کی حکومت بنا سکیں گے۔ مگر یہ جبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ یورپین نواز ہوں اور انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اور مسلمانوں کو بھی یہ مجبوری درپیش ہے کہ وہ حکومت کا کام چلانے کے لئے یورپینوں کو خوش رکھیں۔ کیونکہ یورپینوں کی ناراضی کے بعد وہ ایک دن بھی وزارت کو برسراقتدار نہیں رکھ سکتے۔

تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کا جواب

بنگالی ہندوؤں نے لارڈ کرزن کے زمانے میں تقسیم بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن اور

عملی کارروائی کر کے اسے منسوخ کرایا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت نے ہندوؤں کی خودغرضانہ ذہنیت کو تاڑ کر انہیں غیر منقسم بنگال میں ایسا پچھاڑا کہ اب انہیں کوئی راستہ ہی نہیں سوجھتا۔ پہلے تو انگریزی مال کا بائیکاٹ اور انگریز افسروں پر قاتلانہ حملے کارگر حربے ہو سکتے تھے۔ مگر اب تو مسلمانوں سے پالا پڑا جو وہیں کے رہنے والے اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ مگر اب ان سے قاتلانہ حملوں کا سلسلہ چھیڑا جائے تو بہت سی آبادیاں راکھ کا ڈھیر ہو جائیں۔ اور بہت سے کوچہ و بازار خاک و خون میں لتھڑیں۔

جب تک ہندو اور مسلمان باہم سمجھوتہ نہ کریں یورپیوں کی بات سنی جائے گی۔ اور وہ دونوں سے یہی کہیں گے کہ ہم فارسی مصرعے کو کچھ ترمیم سے پڑھیں گے۔ شاعر نے تو کہا تھا کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

مگر ہم تو یہی گزارش کرینگے۔ کہ

نرخ ارزاں کن کہ بالائی ہنوز

پنجاب کا فیصلہ

پنجاب میں نمایندگی کا فیصلہ یوں کیا گیا۔ کہ مسلمانوں کو ۱۷۵ انشستوں میں سے ۸۶ نشستیں جداگانہ انتخاب سے دی گئیں۔ ۵ نشستیں بڑے زمینداروں کے لئے اور تین مزدوروں کے لئے مخلوط انتخاب سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

زمینداروں کی ۵ نشستوں میں سے تین نشستیں مسلمانوں کے ہاتھ آنے والی تھیں اور مزدوروں کی نشستوں میں سے بھی ایک دو نشستیں ہاتھ آنے کی اُمید ہو سکتی تھی۔ اس طرح انہیں ۱۷۵ میں سے ۸۹ نشستیں تو بہرحال حاصل رہیں۔ اور کبھی کبھی اس سے بھی ایک آدھ نشست زیادہ ہونے کی گنجائش رہی۔

اس طرح گو جُداگانہ انتخاب سے مسلمانوں کو اکثریت نہ ملی۔ مگر عملاً اسمبلی کے ایوان میں ان کی ایک دو ووٹوں کی اکثریت ہوگئی۔

پنجاب اور بنگال کا فرق

پنجاب میں رجعت پسند اور آزاد خیال مسلمانوں کو اسمبلی میں اپنی اقلیت پسند نہ تھی۔ اور جہاں ایک فریق محض اپنی آواز بلند کرتا تھا۔ دوسرا فریق تحریک کشمیر میں مسلمانانِ پنجاب کی قوتِ عمل کا مظاہرہ بھی کر چکا تھا۔ اور حکومت کے افسر اپنی محکمانہ رپورٹوں میں اس کا اقرار بھی کر چکے تھے۔ اس لئے حکومت مسلمانوں کے ساتھ زیادہ بے انصافی کرنا گوارا نہ کر سکتی تھی۔

بنگال میں مسلمان ایسے دل شکستہ، پس افتادہ اور منتشر تھے کہ وہ ۴۰ فی صدی سے ۴۹ فی صدی تک پہنچنا ہی محال سمجھتے تھے۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے بھی اُس وقت تک قابل نہ تھے۔ اس لئے انہیں سب سے بڑی مگر نصف سے چھوٹی پارٹی بنا کر بھی آسانی سے گزارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

باقی صوبوں میں نمایندگی

باقی صوبوں میں نمایندگی کے تناسب پر بحث کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے۔ کیونکہ وہاں کوئی قابلِ قدر تنازعہ نہیں ہے۔ اقلیت کے صوبوں میں پرانے پاسنگ کو قائم رکھا گیا اور سرحد اور سندھ میں ہندو اقلیتوں کو کافی پاسنگ دیا گیا۔

(۱۶)

وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے کے بعد اچھوتوں کا قصہ

وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے میں اچھوت قوموں کو بھی کئی صوبوں میں جداگانہ انتخاب سے چند نشستیں دی گئی تھیں۔ مجھے اس مقام پر ان کی تفصیل میں جانا پیش نظر نہیں۔ کیونکہ اس کا نفس مضمون سے کوئی گہرا تعلق نہیں۔ مجھے تو یہ بیان کرنا ہے کہ اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب دینے کا نتیجہ کیا ہؤا۔ حکومت کو اپنا فیصلہ کیونکر بدلنا پڑا۔

گاندھی جی کی مکرر تنبیہ

گاندھی جی جب گول میز کانفرنس میں گئے تھے۔ تو وہاں وہ اچھوتوں کے بارے میں خاص طور پر کہہ آئے تھے۔ کہ وہ انہیں جداگانہ دئے جانے کے حق میں نہیں ہیں چنانچہ انہوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۳۱ء کو اقلیتوں کی کمیٹی کے اجلاس میں جو سینٹ جیمز نامی محل میں منعقد ہؤا تھا، کہہ دیا تھا کہ اگر اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب دیا گیا، تو میں اپنی جان سے اس کی مخالفت کروں گا۔

گاندھی جی اور وزیر اعظم برطانیہ کی خط و کتابت

یرودا جیل سے خط

۱۱ر مارچ ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی نے سر سیموئیل ہور کو جو ان دنوں وزیر تھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے کے صادر ہونے سے پہلے میں پھر یاد دلا دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے گول میز کانفرنس کے موقع پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب دیا گیا۔ تو میں اپنی جان سے اس کی مخالفت کرونگا۔ گاندھی جی نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ "اچھوتوں کی پوزیشن باقی لوگوں سے مختلف ہے۔ اوروں کے بارے میں خواہ کچھ ہو اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب نہیں دیا جانا چاہئیے۔ میں اس بات کے خلاف نہیں کہ انہیں اسمبلیوں میں نمایندگی دی جائے۔ میں تو اس بات کے حق میں ہوں۔ کہ ان کے ہر بالغ مرد اور عورت کا نام رائے دہندوں کے رجسٹر میں تحریر کیا جائے۔ اور تعلیم یا جائداد کی کوئی شرط عاید نہ کی جائے۔ خواہ اوروں کے لئے یہ شرائط عائد کر دی جائیں لیکن میری رائے ہے کہ اچھوتوں کے لئے بھی اور ہندو دھرم کے لئے بھی جداگانہ انتخاب نقصان دہ ہے۔ گو خالص سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس کا کچھ ہی اثر کیوں نہ ہو۔ اس نقصان کا اندازہ لگانے کے لئے جو جداگانہ انتخاب سے اچھوتوں کو ہوگا یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ کس طرح ان ہندوؤں میں کھڑے ہوئے ہیں جنہیں اعلیٰ جاتیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ اور وہ کس طرح ان کے رحم پر ہیں۔ جہاں تک ہندو دھرم کا تعلق ہے۔ جداگانہ انتخاب تو اسے ٹکڑے ٹکڑے اور منتشر کر دے گا ....

"ان حالات میں میں ملک معظم کی حکومت کو مؤدبانہ اطلاع دیتا ہوں۔ کہ اگر انہوں نے

اچھوتوں کے لئے جُداگانہ انتخاب کا فیصلہ صادر کیا۔ تو میں مرن برت رکھوں گا۔۔۔۔"

گاندھی کا خط طویل ہے کہ ہم حسب ضرورت اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔

سر سیموئیل ہور کا جواب

سر سیموئیل ہور نے ۱۳ر اپریل ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی کو جواب لکھا۔ جس میں کہا کہ لوتھیان کمیٹی کی رپورٹ ابھی چند ہفتوں تک میسر نہ آسکے گی۔ جس نے متنازعہ امور کے بارے میں سفارشیں کرنی ہیں۔ جب وہ رپورٹ آجائے گی۔ تو اس پر غور کیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے اور آپ کے ہم نوا اصحاب کے زوردار خیال کو بھی زیر غور لایا جائیگا۔

گاندھی جی کا خط مسٹر میکڈانلڈ کو

۱۸۔ اگست کو گاندھی جی نے پھر یرودا جیل سے ایک خط لکھا اور اب کے براہِ راست مسٹر میکڈانلڈ کو لکھا جو ان دنوں برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس خط میں اُس خط کا حوالہ بھی دیا گیا۔ جو سر سیموئیل ہور کو لکھا گیا تھا۔ اور اسے موجودہ خط کا جزو تصوّر کرنے کے لئے کہنے کے بعد کہا گیا۔ کہ "میں نے اقلیتوں کے بارے میں برطانوی حکومت کا فیصلہ پڑھ لیا ہے۔ اور میں اسے پڑھ کر سو بھی چکا ہوں۔ (یعنی محض جوش میں خط نہیں لکھ رہا۔ بلکہ خوب سو کر اور سونے کے بعد اُٹھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں جس کا ذکر کر رہا ہوں)، میں نے اس خط کے مطابق جو میں نے سر سیموئیل ہور کو لکھا تھا۔ اور اس اعلان کے مطابق جو میں نے اقلیتوں کی کمیٹی کے اجلاس میں سینٹ جیمز کے محل میں تیرہ ۱۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو کیا تھا۔ آپ کے فیصلے کا اپنی جان سے مقابلہ کرتا ہے۔ میرے لئے ایسا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ میں کسی قسم کا کھانا نہ کھاؤں۔ اور محض پانی پیا کروں جس میں نمک یا سوڈے کی آمیزش ہو۔ اور یہ ایک دائمی فاقہ ہو۔ حتیٰ کہ موت مجھے آلے۔ یہ مرن

برت ختم ہو جائے گا۔ اگر اس کے دوران میں برطانوی حکومت اپنی مرضی سے یا رائے عامہ کے دباؤ سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔ اور اچھوتوں کے لئے جُداگانہ انتخاب کی سکیم کو واپس لے کر ان کے نمایندوں کو مخلوط انتخاب کے ذریعے عام حلقوں میں سے منتخب کئے جانے کا فیصلہ کرے۔ خواہ معیار رائے دہی کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

"مجوزہ برت معمولی حالات میں ۲۰ ستمبر کی دوپہر کو شروع ہو گا۔ سوائے اس صورت کے کہ متنازعہ فیصلہ اس سے پہلے واپس لے لیا جائے۔

"میں افسرانِ جیل سے کہہ رہا ہوں کہ اس خط کا مضمون آپ کو بحری تار کے ذریعے بھیج دیں۔ تاکہ آپ کو کافی مہلت مل جائے۔ بہرحال میں اتنا وقت دے رہا ہوں۔ کہ لمبے سے لمبے راستہ سے بھی یہ خط وقت پر آپ کو پہنچ سکے......"

اس خط میں وزیر اعظم سے کہا گیا کہ اس خط و کتابت کو شائع بھی کر دیا جائے۔ تاکہ دنیا کو علم ہو سکے۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ اطلاع بھی دیدی گئی۔ کہ اگر مرن برت سے بچنے کے لئے مجھے رہا بھی کر دیا گیا۔ تو بھی یہ برت جاری رہے گا۔ کیونکہ میرے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

مسٹر میکڈانلڈ کا جواب

مسٹر میکڈانلڈ نے ۸ ستمبر کو جواب لکھا جس میں مختلف باتوں کے متعلق لکھا:۔

(۱) آپ کا خط ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نے ملک معظم کی حکومت کے منشاء کو درست طور پر نہیں سمجھا ہے۔

(۲) ہم نے ہمیشہ یہ بات ذہن نشین رکھی ہے۔ کہ آپ ہندو قوم سے اچھوتوں کو علیحدہ کئے جانے کے برخلاف ہیں۔ آپ نے اقلیتوں کی کمیٹی کے اجلاس میں یہ بات واضح کر دی تھی۔

اور بعد کے خط میں بھی۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ اور بہت سے لوگ آپ کے ہم خیال ہیں۔

(۳) اچھوتوں کی جماعتوں کی عرضداشتوں اور ان کی مسلمہ معاشرتی تباہ حالیوں کے پیشِ نظر جن سے آپ کو بھی اتفاق ہے ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ ہم مجالس قانون ساز میں اچھوتوں کو مناسب نمایندگی دیں۔ جس کا ہم انہیں حقدار سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ہم نے ہندو قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی پالیسی اختیار نہیں کی۔ آپ بھی اس امر کے حق میں ہیں۔ کہ انہیں مجالس قانون ساز میں نمایندگی ملے۔ اس لئے ہم نے تو انہیں نو صوبوں میں سے سات میں تھوڑی سی نمایندگی دی ہے۔ تاکہ ان کے اپنے نمایندے ان کی مشکلات کو صوبوں کی حکومتوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

ہم نے ان کو باقی ہندوؤں کے ساتھ عام حلقوں میں رائے کا حق دیا ہے۔ اور وہ عام حلقوں میں اُمیدوار بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ہندو جاتی کے جزو لاینفک رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم نے محض بیس برس کے لئے ان کو بہت تھوڑی سی نمایندگی ایسے انتخاب سے دی ہے جس میں اچھوت خود ہی رائے دہندہ ہوں۔

اس طرح ہندو جاتی کے ٹکڑے ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔

(۴) جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، آپ مرن برت اس لئے نہیں رکھ رہے کہ اچھوتوں کو دوسرے ہندوؤں کے ساتھ مخلوط انتخاب ملے۔ کیونکہ وہ دیا ہی گیا ہے۔ اور نہ ہندوؤں کے سنگھٹن کو قائم رکھنے کے لئے کیونکہ اس کا بھی سامان کیا گیا ہے۔ بلکہ اچھوتوں کو اس تھوڑی سی نمایندگی سے بھی محروم کرنے کے لئے جو ان کو دی گئی ہے۔

(۵) ہندوستانیوں کے باہم اختلاف کے باعث حکومت نے بادلِ ناخواستہ فرقہ وارانہ فیصلہ صادر کرنے کا ذمہ لیا۔ اس نے وہ فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اور اب اس میں ترمیم انہیں

شرائط کے ماتحت ہو سکتی ہے۔ جن کا اعلان کیا گیا ہے۔ (یعنی باہمی مفاہمت کے ذریعے)

(۶) خط و کتابت شائع کرنے کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ اگر آپ خط کے پہنچنے پر پھر خط و کتابت کے شائع کرنے کا مطالبہ کریں۔ تو وہ شائع کر دی جائے گی۔

گاندھی جی کا جواب

گاندھی جی نے اس خط کے جواب میں اور باتوں کے علاوہ لکھا۔ کہ:۔

(۱) میرے لئے یہ معاملہ مذہب کا معاملہ ہے۔ محض سیاسی معاملہ نہیں ہے۔ اچھوتوں کو دو دو ووٹ مل جانے سے نہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور نہ ہندو قوم ٹکڑے ہونے سے بچ سکتی ہے۔ میں جداگانہ انتخاب کو جو اچھوتوں کو دیا جا رہا ہے ایک ایسا زہر سمجھتا ہوں۔ جو ہندو قوم کے جسم میں ٹیکہ کے ذریعے پھیلایا جا رہا ہے۔ اور جو ہندو دھرم کو تباہ کر دیگا۔ مگر اچھوتوں کو کوئی نفع نہ پہنچائے گا۔

(۲) آپ اس معاملہ کو سمجھنے کے قابل نہیں، خواہ آپ کتنے ہی ہمدرد کیوں نہ ہوں۔ میں اچھوتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی دینا برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن میں ان کی قانونی علیحدگی برداشت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ ہندو دھرم کی شرن میں ہیں۔

(۳) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کا مجوزہ آئین قائم ہو جائے۔ تو آپ ہندو مصلحین کے اس کام کی شاندار ترقی کو روک دینگے۔ جو وہ اپنے اچھوت بھائیوں کو ہر شعبہ زندگی میں اونچا لے جانے کے لئے کر رہے ہیں۔

(۴) یہ نہ سمجھا جائے کہ میں فرقہ وارانہ فیصلہ سے فقط اچھوتوں کے بارے میں اختلاف رکھتا ہوں۔ اور اختلافات بھی ہیں۔ مگر وہ ایسے نہیں جو مجھے مرن برت تک لے جائیں۔

مرن برت اور نیا فیصلہ

گاندھی جی نے ۲۰ ستمبر کو اپنا مرن برت شروع کیا۔ ملک میں اس سے پہلے خط و کتابت شائع ہو چکی تھی۔ اور ہر طرف ایک سنسنی سی پھیل رہی تھی۔ دنیا بے چینی سے آنے والے واقعات کا انتظار کر رہی تھی۔

مختصر یہ کہ مرن برت شروع ہوا۔ ہندو لیڈروں نے ہر طرف اپنی آواز اٹھائی کہ گاندھی جی کی قیمتی جان کو بچاؤ۔ اچھوتوں کا لیڈر مسٹر امبیدکار تھا۔ اس کو بھی سمجھایا بجھایا گیا۔ کچھ اچھوت پہلے ہی گاندھی جی کے ہم خیال تھے۔ جب دونوں خیالات کے اچھوت لیڈر متفق ہو گئے۔ تو اچھوتوں نے جداگانہ انتخاب سے دست برداری دیدی۔ اور اعلیٰ جاتیوں کے ہندوؤں نے ان کے لئے مختلف صوبوں میں مخلوط انتخاب سے نشستیں مخصوص کر دیں۔ اور یہ نشستیں سب صوبوں میں حکومت کی جداگانہ انتخاب کی مقررہ نشستوں سے زیادہ تھیں۔

انتخاب کا طریقہ یہ رکھا گیا کہ اچھوتوں کے حلقوں میں اچھوت اور غیر اچھوت رائے دہندے ہوں۔ مگر پہلے اچھوت لوگ ہی رائے دیں۔ جن کا چار اُمیدواروں کو اس انتخاب میں سب سے زیادہ رائے دہندے رائے دیں، وہ عام حلقہ کے لئے امیدوار ہوں۔ اور اب اچھوت اور اعلیٰ جاتیوں کے رائے دہندے مل کر دوبارہ ووٹ ڈالیں پھر جس اُمیدوار کو زیادہ ووٹ ملیں۔ وہ منتخب شمار ہو۔

گاندھی جی کی کامیابی کے اثرات

گاندھی جی کی یہ کامیابی شاندار اور تاریخی کامیابی تھی۔ جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کامیابی کے کئی ایک اثرات ہوئے۔ جو ہندوؤں اور اچھوتوں کے باہمی تعلقات سے

باہر بھی اثر انداز ہوئے۔

اس کامیابی کا ایک اثر یہ ہُوا کہ گاندھی جی کے ہندو سنگھٹن کے جذبے کو دیکھ کر مسلمان متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ عام ذہنوں میں یہ خیال چکر لگانے لگا کہ ہندو قوم کا ہندو لیڈر تو ہندو سنگھٹن کی خاطر جان دینے کی دھمکی سے حکومت کو متأثر کر سکتا ہے۔ اور ہندو قوم سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ اور پھر بھی وہ ملک کی مشترکہ جماعت یعنی کانگریس کا اکلوتا لیڈر رہ سکتا ہے۔ کیا کسی مسلمان کے لئے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی اقلیت کے باوجود مسلم تنظیم و یگانگت کی رٹ لگائے اور پھر وہ فرقہ پرست نہ کہلائے بلکہ مشترکہ وطنی جماعت کا واحد اور مسلمہ لیڈر ہو سکے؟ چونکہ یہ بات عام مسلمانوں کے نزدیک قابلِ عمل نہ تھی۔ اس لئے انہیں اپنی کمزوری کا بیش از بیش احساس ہُوا۔

دوسرا اثر یہ ہُوا کہ مسلمان سوچنے لگے۔ کہ اگر اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب سے چند نشستیں مل جانا گاندھی جی کے نزدیک ہندو قوم کے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہے تو کیا مخلوط انتخاب جس کے لئے مسلمانوں کو ہمیشہ دعوت دی جاتی ہے مسلم قوم کی یگانگت اور تنظیم کلی کے منافی تو ثابت نہ ہو گا۔ وہ خدشات جو مخلوط انتخاب کے خلاف پہلے ہی ظاہر کئے جاتے تھے اب زیادہ مضبوط ہونے لگے۔

تیسرا اثر یہ بھی ہُوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک طبقہ اچھوتوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے فیصلے کو دیکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے جھگڑوں کو چکانے کی جدوجہد کی طرف مائل ہُوا۔

چنانچہ اب ہمیں اس کارروائی کی طرف توجہ دینا ہے جو اچھوتوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے باہمی فیصلہ کے بعد ہندو مسلم مفاہمت کے بارے میں رونما ہوئی۔

(۱۷)

وزیر اعظم کے فیصلے کے بعد ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں

وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے کو بنگال کے یورپین ہی خندہ پیشانی سے قبول کر سکتے تھے اور لوگوں نے تو ہر طرف اس کی مخالفت کی۔ کوئی کسی بنا پر مخالفت کرتا تھا۔ اور کوئی کسی بنا پر۔ ہندو کہتے تھے کہ مسلمانوں کو بہت کچھ دیا گیا ہے۔ اور مسلمان کہتے تھے کہ ہم نے بہت کچھ مانگا تھا لیکن ہمیں بہت کم دیا گیا ہے۔

مختلف کانفرنسیں اور جلسے ہوئے جن میں وزیر اعظم کے فیصلے کے خلاف ہندوؤں۔ مسلمانوں۔ سکھوں۔ عیسائیوں۔ قوم پسندوں اور رجعت پسندوں نے اپنی اپنی وجوہات کی بنا پر مخالفت کی۔

جب گاندھی جی کے مرن برت کی بدولت اچھوتوں کے طریق انتخاب کا جھگڑا چکا دیا گیا تو ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں ہونے لگیں۔ اب کے مولانا شوکت علی مرحوم اور پنڈت مدن موہن مالویہ پیش پیش تھے۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے وائسرائے کو تاریں بھیج کر

بہت کوشش کی۔ کہ گاندھی جی کو رہا کر دیا جائے۔ یا ان سے ملاقات کی اجازت ہی ملے۔ تاکہ ہندو مسلم مفاہمت میں ان سے امداد لی جاسکے۔ لیکن حکومت نے گاندھی جی کو رہا کرنا یا کسی کو ان سے ملاقات کی اجازت دینا گوارا نہ کیا۔

مولانا شوکت علی۔ چوہدری خلیق الزمان۔ شیخ عبدالمجید سندھی اور دوسرے مسلمانوں کی مفاہمت کی کوششوں کو دیکھ کر آل انڈیا مسلم کانفرنس کے مسلم لیڈروں نے اپنا مخالفانہ اظہار خیال مناسب سمجھا۔ چنانچہ اُنہوں نے ۷ راکتوبر کو شملے سے ایک بیان جاری کیا۔ جو سر محمد اقبال مرحوم۔ سر ضیاء الدین احمد۔ سر ذوالفقار علی خاں مرحوم اور دیگر بزرگوں کے نام سے شائع ہوُا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ

"ہم نے اخبارات میں ان گفت گوؤں کے متعدد حالات پڑھے ہیں۔ جو بعض مسلمانوں نے فرقہ وارانہ فیصلے کو بدلنے" کے لئے جاری کر رکھی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گفت وشنید محض طریق انتخاب تک محدود ہے۔ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی شخص نے ان دیگر امور کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جن کو مسلمانانِ ہند نے ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی مؤثر اکثریت۔ سندھ کی علیحدگی۔ وفاقی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمایندگی۔ اور سرکاری ملازمتوں اور وزارتوں میں مسلمانوں کی مؤثر اور مناسب نمایندگی۔

"مسلمانانِ ہند نے ہمیشہ ہندو اکثریت کے ساتھ سمجھوتے کی خواہش کی ہے۔ جیسا کہ ہر اس شخص پر واضح ہے جس نے گزشتہ دس سال کی ان بے شمار کوششوں کا مطالعہ کیا ہے جو فرقہ وارانہ دوستی اور اتحاد کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے کی گئی ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے جھگڑے کو اس وقت از سرِ نو چھیڑنا نامناسب ہوگا

کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہماری قوم موجودہ وقت میں اس تحفّظ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کوئی بحث جو فقط طریقِ انتخاب کے بارے میں ہو لاحاصل ہوگی۔ تاہم ہم اس امر کے خلاف نہیں کہ ہندو قوم کے رہنما تمام اہم مسائل کے بارے میں کوئی تجاویز مرتب کریں۔ لیکن ہم یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں۔ کہ اس قسم کی واضح تجاویز ہندو اکثریت کی طرف سے آنی چاہئیں "

اس بیان کے حق میں بھی کئی جگہ سے اظہارِ خیال ہوا اور اس کے خلاف بھی لیکن ان آزاد خیال رہنماؤں نے جو مفاہمت کی جد و جہد میں مصروف تھے' اپنے رجعت پسند طبقے کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

مسلم کانفرنس کے مطالبات کی حمایت

۱۶۔ اکتوبر کو لکھنؤ میں تمام مسلم جماعتوں کی مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا گیا جسمیں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی مرحوم سے لے کر نیچے تک بہت سے آزاد خیال کارکن موجود تھے۔ اس کانفرنس نے بحث و تمحیص کے بعد ایک قرارداد منظور کی جس میں

(۱) مختلف الخیال مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ تاکہ مسلمانانِ ہند کی اُمنگوں کو پورا کیا جاسکے اور مختلف قوموں کے اتحاد پر زور دیا گیا۔ تاکہ ذمہ دار حکومت حاصل کی جاسکے۔

(۲) مسلم کانفرنس کی یکم جنوری ۱۹۲۹ء کی قرارداد کو مسلم مطالبات کی بنیاد قرار دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ جمعیۃ العلماء دہلی کی سہارنپور کی ۱۹۳۱ء کی قرارداد کے اس حصّے کو شامل کیا گیا۔ جو طریقِ انتخاب کے علاوہ قاضیوں وغیرہ کے تقرر اور شخصی قانون کے رواج کے متعلق تھا۔

(۳) ان مطالبات کے تسلیم کئے جانے کے بعد جداگانہ انتخاب کی بجائے مخلوط انتخاب کی تائید کا فیصلہ کیا گیا۔ جس میں مولانا محمد علیؒ مرحوم کے فارمولا یا کسی اور مناسب طریقے کو بنیاد قرار دیا جائے۔

(۴) پنڈت مالویہ کے اس مشورے کی تائید کی گئی کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نمایندوں سے گفت گو کرنے کے لئے ایک کمیٹی منتخب کی جائے۔

۲۰ اکتوبر کو نئی دہلی میں مسلم نمایندوں نے پنڈت مالویہ سے گفتگو کی۔ اور اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ ۳۰۔ اکتوبر کو الہ آباد میں ہندو اور سکھ نمایندوں سے گفت وشنید کی جائے۔

ڈاکٹر مونجے کا بیان

۲۲ اکتوبر کو ڈاکٹر مونجے نے ایک بیان شائع کیا۔ جس میں

(۱) مسلم رہنماؤں کی مفاہمت کی کوششوں کو سراہا گیا۔ اور مخلوط انتخاب کی بناء پر سمجھوتہ کرانے کے لئے اپنی مخلصانہ خدمات پیش کیں۔

(۲) کسی صوبہ میں کسی اکثریت والی قوم کے لئے نشستوں کی اکثریت مخصوص کرنے کی مخالفت کی گئی۔

(۳) کسی صوبہ میں کسی اقلیت کو اس کی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں دئیے جانے کی مخالفت کی گئی۔

(۴) یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر کسی اقلیت کو پاسنگ دیا جائے۔ تو وہ سب قوموں کی اقلیتوں کے لئے یکساں ہو۔ اور ہر صوبہ میں اس پر یکساں عملدرآمد کیا جائے۔

(۵) سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کی گئی۔ اور اس کے لئے وجوہات دی گئیں۔

بنگال ہندو سبھا کا بیان

۲۲۔ اکتوبر کو ہی کلکتہ سے بنگال ہندو سبھا کے صدر نائب صدر اور دو سکرٹریوں نے

ایک بیان جاری کیا۔ جس میں

(۱) مناسب اور قومی بنیادوں پر فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے مُسلم رہنماؤں کی کوششوں کو خوش آمدید کہی گئی۔

(۲) کسی صوبہ میں کسی اقلیت کو اس کی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں دینے کی مخالفت کی گئی۔

(۳) پاسنگ کے متعلق بھی وہی کہا گیا۔ جو ڈاکٹر مونجے نے کہا تھا۔

(۴) سندھ کے متعلق بھی ڈاکٹر مونجے والی پوزیشن لی گئی۔

مسلم لیگ کونسل کا بیان

مسلم لیگ کونسل نے ۲۳ راکتوبر کو نئی دہلی میں ایک قرارداد منظور کی جس میں :۔

(۱) مفاہمت کی ہر کوشش کو لبیک کہا گیا۔ مگر ساتھ ہی اپنا فیصلہ محفوظ رکھا گیا۔ تاآنکہ گفتگو کے نتائج سامنے نہ آجائیں۔

(۲) یہ کہا گیا کہ مُسلم قوم اس حق میں نہیں کہ اسے فرقہ وارانہ فیصلے سے جو کچھ حاصل ہُوا ہے۔ اس سے دست کش ہو جائے۔ تاآنکہ کوئی ایسی متبادل سکیم پیش کی جائے۔ جس سے مسلمانوں کی پوزیشن بہتر اور مضبوط ہوتی ہو۔

(۳) اس امر پر زور دیا گیا کہ گو ہم جُداگانہ انتخاب کے حامی ہیں۔ تاہم ہم ہندو اکثریت کی واضح تجاویز سامنے آنے تک اپنا فیصلہ محفوظ رکھتے ہیں۔

اتحاد کانفرنس کا پہلا اجلاس

اتحاد کانفرنس کا پہلا اجلاس ۳۔ نومبر ۱۹۳۲ء کو الہ آباد میں ہُوا۔ مسٹر وجیا راگھوا چاریا کو اس کانفرنس کی صدارت تفویض کی گئی۔ کوئی ستر ہندو۔ چالیس مسلم۔ ۸ سکھ اور چند

ہندوستانی عیسائی اور دیگر قوموں کے رہنما اس کانفرنس میں شامل ہوئے۔ اتحاد قومی کے متعلق شاندار اور پُرجوش تقریریں ہوئیں۔ اور نزاکت وقت کا احساس کرایا گیا۔

اتحاد کانفرنس نے ایک مختصر سی اتحاد کمیٹی نامزد کی۔

اتحاد کمیٹی

اس اتحاد کمیٹی نے ۳۔ نومبر سے ۱۷۔ نومبر تک اپنے اجلاس جاری رکھے۔ ۲۳ مرتبہ یہ اجلاس ہوئے۔ اس کمیٹی نے دو ہفتہ کی کارروائی کے بعد اپنی تجاویز پیش کیں جن کا متعلقہ خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) مرکز میں مسلمانوں کو ۳۲ فی صدی نشستیں دی جائیں۔

(۲) مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔ اور مولانا محمد علی مرحوم کے فارمولا کو قدرے ترمیم کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یعنی دس برس تک یہ دستور رہے۔ کہ جن اُمیدواروں نے اپنی قوم کے ۳۰ فی صدی ووٹ حاصل کئے ہوں اور ان میں سے جس نے زیادہ ووٹ حاصل کئے ہوں۔ وہ منتخب سمجھا جائے۔ اگر کوئی اُمیدوار اپنی قوم کے ۳۰ فی صدی ووٹ حاصل نہ کر سکے۔ تو ان دو اُمیدواروں میں سے جنہوں نے اپنی قوم کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے ہوں۔ وہ منتخب سمجھا جائے۔ جس کو سب سے زیادہ ووٹ ملے ہوں۔

(۳) مسلم اقلیتوں کو دس سال تک وہی پاسنگ دیا جائے۔ جو برطانوی وزارت کے فیصلے سے پہلے دیا جاتا تھا۔

بنگال کا فیصلہ

(۴) بنگال میں مسلمانوں کو ۵۱ فی صدی اور ہندوؤں وغیرہ کو ۴۷ ۴/۵ فی صدی

نشستیں دی جائیں۔ اور مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔

(۵) دس سال کے بعد نشستوں کی تخصیص اور خاص نشستیں ختم کر دی جائیں۔

(۶) مسلمان مخلوط انتخاب اسی حالت میں منظور کریں گے۔ اگر ان کو کل نشستوں کا اکاون فی صدی دیا جائے۔

(۷) نشستوں کی تخصیص ختم کی جائے تو حق رائے دہی بالغان نافذ ہو۔

مذکورہ بالا تمام شرائط لازم و ملزوم ہوں۔

پنجاب کا فیصلہ

پنجاب کے بارے میں بھی یہی ہؤا کہ مسلمانوں کو ۵۱ فی صدی نشستیں دی جائیں۔

سندھ کا فیصلہ

سندھ کو علیحدہ کرنے اور وہاں ہندو اقلیت کو ۲۷ فی صدی نشستیں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ وزارت میں کم از کم ایک ہندو لئے جانے کا بھی فیصلہ ہؤا۔

بنگال میں اتحاد کانفرنس کی شکست

مختلف اجلاسوں میں اتحاد کانفرنس نے ان اور دیگر مسائل پر بحثیں کیں۔ اور یکجہتی کی صورت پیدا کی۔ مگر یہ سب کارروائی لازم و ملزوم تھی۔ اور چونکہ بنگال کا معاملہ دسمبر کے مہینے تک طے نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اس مہم کو سر کرنے کے لئے پنڈت مالویہ جی نے کلکتہ کا سفر کرنے اور وہاں اتحاد کانفرنس کے نمائندوں کو ساتھ لے کر بنگال کے ہندوؤں سے گفت و شنید کرنے کا عزم کیا۔

کئی روز گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار ۳۱ ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو بنگال کے ہندوؤں نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ بنگال کے مسلمانوں کو ۵۱ فی صدی نشستیں مہیا کرنے کے لئے ضرورت تھی۔ کہ دو نشستیں ہندوؤں سے لے کر مسلمانوں کو دی جائیں۔ لیکن بنگال کے ہندو اس بات کے لئے تیار نہ تھے۔ یورپینوں کو بنگالی ہندوؤں اور بنگالی مسلمانوں کا حصّہ کاٹ کر ۲۵ نشستیں دی جا چکی تھیں۔ اس لئے بنگالی ہندو اب مزید دو نشستیں کم کر کے بنگال بلکہ سارے ہندوستان میں مخلوط انتخاب رائج کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے۔ وہ کسی حالت میں مسلمانوں کو آئینی اکثریت دینے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لئے الہ آباد کا فیصلہ کلکتہ میں جا کر دریا برد ہو گیا۔

سر سیموئیل ہور کا اعلان

۳۱ر دسمبر سے ایک ہفتہ پہلے یعنی ۲۴ر دسمبر کو سر سیموئیل ہور نے تیسری گول میز کانفرنس کی اختتامی تقریر کرتے ہوئے اعلان کر دیا تھا۔ کہ مسلمانوں کو مرکز میں ۳۳ ۱/۳ نشستیں ملیں گی۔ اور سندھ اور اڑیسہ علیحدہ صوبے بنا دئے جائیں گے۔ ہندوؤں نے ۳۲ فی صدی نشستیں مسلمانوں کو دینا پسند کیا تھا۔ اور ۱/۳ ۱ فی صدی نشستوں کا بخل انہیں مطلوب تھا۔ مگر حکومت نے اس کمی پورا کر کے مسلمانوں کو ممنون کرنے کا آسان موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

(۱۸)

اتحاد کانفرنس کے ناکام ہونے پر

بنگال میں اتحاد کانفرنس کی یادگار ناکامی کے بعد ہندو اور مسلمان پھر اپنا زاویہ نگاہ پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔ وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے پر ہر طرف پہلے سے بھی زیادہ نکتہ چینی ہونے لگی۔ جب وزیر اعظم کے فیصلے کے بعد مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ لوگوں کے سامنے آئی۔ اور حکومت نے قرطاس ابیض شائع کیا۔ تو اور بھی لے دے ہوئی۔

کانگرس کے باہر کی کیفیّت

اس سلسلے میں مجھے کانگرس کے علاوہ دیگر جماعتوں کی پوزیشن کے بارے میں کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ انہوں نے تو اپنی اپنی رٹ لگائی ہی تھی۔ ہندو مہاسبھا نے جگہ جگہ جلسے کر کے فرقہ وارانہ فیصلے اور قرطاس ابیض کی سکیم کی پُر زور مخالفت شروع کر دی۔ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے ارکان نے فرقہ وارانہ فیصلے کو نامنظور نہ کیا۔ گو اُنہوں نے کئی معاملات میں حکومت کے فیصلے کے خلاف اظہار اختلاف کیا۔ مجلس احرار نے

بھی فرقہ وارانہ فیصلے کی مذمت کی مگر وہ اس بنا پر تھی کہ مسلمانوں کے تمام مطالبات پورے نہیں کیئے گئے۔

کانگرس کی پوزیشن

مگر اس سلسلے میں مجھے اب کانگرس کی پوزیشن کے متعلق قدرے تفصیل سے ذکر کرنا ہے۔ کیونکہ آیندہ سیاست کی گتھی کانگرس کے رویئے سے ہی الجھتی چلی آئی ہے۔

چونکہ کانگرس کے رہنما قید و بند کے مصائب میں مبتلا رہے تھے اس لئے زیادہ جلدی اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ اجتماعی رائے کے اظہار کے لئے انہیں ۱۷ اور ۱۸ جون کو موقعہ ملا جبکہ کانگرس کی مجلس عاملہ نے فرقہ وارانہ فیصلے اور ۱۷ مارچ ۱۹۳۳ء کے قرطاس ابیض کے متعلق غور و فکر کے بعد اپنی رائے ظاہر کی۔

کانگرس کی مجلس عاملہ نے اپنی قرارداد میں پہلے تو قرطاس ابیض کی سکیم کی مذمت کی اور اس کے ساتھ ہی اپنی متوازی تجویز پیش کی۔ کہ قرطاس ابیض کا تسلی بخش بدل یہ ہے کہ تمام ملک کی ایک نمائندہ اسمبلی بلائی جائے جس کے ارکان ایسے معیار رائے دہی کی بنا پر جو رائے دہی بالغان کے قریب قریب ہو منتخب شدہ ہوں اور گرامی قدر اقلیتوں کو اس نمائندہ اسمبلی میں اگر وہ اقلیتیں چاہیں تو جداگانہ انتخاب سے نمائندے منتخب کرکے بھیجنے کا حق دیا جائے۔

فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق

اس ابتدائی اظہار خیال کے بعد مجلس عاملہ نے وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے کی طرف توجہ مبذول کی اور کہا:۔

"چونکہ ملک کے مختلف فرقے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق شدید اختلاف رائے

رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں کانگرس کی پوزیشن واضح کرنا ضروری ہے۔
کانگرس اس بات کی دعویدار ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کو ترکیب دینے والے مختلف فرقوں کی مساویانہ نمایندہ ہے اور اس لئے اس اختلاف رائے کے پیش نظر وہ اس فرقہ وارانہ فیصلے کو اس وقت تک نہ منظور کر سکتی ہے اور نہ نامنظور جب تک کہ یہ اختلاف رائے موجود رہتا ہے۔

فرقہ وارانہ فیصلے کا علاج

مجلس عاملہ نے اس اظہار خیال کے بعد فرقہ وارانہ فیصلے کو بالکل ناتسلّی بخش قرار دیا اور پھر کہا:۔
"مگر یہ ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے نامناسب نتائج کو روکنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ متفقہ حل تک پہنچنے کے ذرائع اور وسائل تلاش کئے جائیں اور اس مسئلے میں جو ہندوستان کا گھریلو مسئلہ ہے برطانوی حکومت یا کسی اور ملکی ادارے کو فیصلے کے لئے نہ پکاریں۔"

غیر ملکی ادارہ

برطانوی حکومت کے علاوہ دیگر غیر ملکی ادارے کا ذکر اس امر کو یاد دلاتا ہے کہ ہندو مہاسبھا کی طرف سے بار بار اس بات کا مطالبہ ہو رہا تھا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی اقلیتوں کے مسئلے کو مجلس اقوام کے سپرد کر دے۔ یہ مطالبہ اس بنا پر کیا جا رہا تھا کہ مجلس اقوام نے یورپ کے مختلف ملکوں میں فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے ان فرقوں کی اقلیتیں قرار دیا تھا جو بیس فی صدی سے زیادہ نہ ہوں۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بیس فی صدی سے زیادہ تھی اس لئے اس فارمولے کی رُو سے ہندوستان کے

مسلمان مرکز کے لئے کسی قسم کے تحفظ کا مطالبہ نہ کر سکتے تھے۔ اور اسی طرح پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں بھی بلکہ ہر اکثریت کے صوبے میں اور ان اقلیت کے صوبوں میں جہاں ان کی تعداد بیس فی صدی سے زیادہ ہو کوئی تحفظ نہ مانگ سکتے تھے۔

ان حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کانگرس کی مجلس عاملہ نے "غیر ملکی ادارے" کے لفظ کو استعمال کر کے ہندو مہا سبھا کے مذکورہ بالا مطالبے کی بھی تردید کر دی۔

تصدق احمد خاں شروانی مرحوم کا بیان

مجلس عاملہ کی اس قرارداد کے بعد مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مرحوم نے کانگرس کی تائید میں بڑے شدومد سے ایک بیان دیا جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ کہا گیا "کانگرس نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا ہے کہ وہ فی الحقیقت ایک قومی جماعت ہے اور ملک کے مختلف فرقوں کے متعلق اپنی ذمہ داری کا مساویانہ احساس رکھتی ہے اگر اس بارے میں کسی کو کوئی شک بھی تھا تو وہ اب قطعاً دور ہو جانا چاہئے۔"

شروانی مرحوم کا یہ بیان بھی ایک یادگار بیان ہے۔ اس کو نقل کرنا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ کانگرس کے ارباب بست و کشاد اس پوزیشن کے بعد جب نیا مقام تلاش کرتے ہیں تو تفاوتِ راہ کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔

غیر جانبداری کی پوزیشن کا اثر

کانگرس نے جب اس غیر جانبداری کی پوزیشن کو اختیار کیا تو ہندو سبھا کی طرف سے اس پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ اور یہ نکتہ چینی اپنی انتہا کو پہنچنے لگی۔ جب جنوری ۱۹۳۵ء کے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں حکومت نے مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ بحث کے لئے پیش کی۔ اور مختلف فرقوں نے اپنی اپنی ترمیمیں پیش کیں۔

کانگرس پارٹی نے کانگرس کی پوزیشن کے مطابق اپنی غیر جانبداری کی ترمیم پیش کی۔ اس کے برعکس مسٹر جناح نے یہ ترمیم پیش کی کہ :-

"یہ اسمبلی فرقہ وارانہ فیصلہ کو منظور کرتی ہے جب تک کہ مختلف قومیں کوئی متفقہ فیصلہ نہ کریں۔"

غیر کانگرسی ہندوؤں کی پوزیشن یہ تھی۔ کہ وہ کانگرس کی پوزیشن کو غلط سمجھتے تھے۔ اور مسٹر جناح کی ترمیم کے سخت مخالف تھے۔

صوبجاتی کونسلوں میں تو حکومت نے اس مسئلہ میں غیر جانبداری کا اصول قائم کیا تھا۔ مگر خاص مصالح کی بنا پر اسے مرکز میں یہ اصول ترک کرنا پڑا۔ کیونکہ اس طرح کانگرس کے کامیاب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

جب کانگرس کی ترمیم پیش ہوئی۔ تو حکومت نے اس کے خلاف ووٹ دیئے مسلمانوں نے تو اس کے خلاف ووٹ دینے ہی تھے۔ غیر کانگرسی ہندوؤں کو بھی اس ترمیم کے خلاف ہی ووٹ دینے کی ضرورت پڑی۔ اس لئے کانگرس کی اپنی ۴۴ رائیں ہی اس ترمیم کے حق میں رہیں۔

جب مسٹر جناح کی ترمیم کی نوبت آئی۔ تو کانگرس اپنی پوزیشن کے پیش نظر غیر جانبدار رہی۔ حکومت کو فرقہ وار فیصلہ کی تائید کرنا لازم تھا۔ کیونکہ وہ خود اس فیصلہ کو صادر کر چکی تھی۔ اس لئے غیر کانگرسی ہندوؤں کے چند ووٹ ہی مخالفت میں آئے اور یہ ترمیم کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔

ان حالات میں ہندو مہاسبھا کو کانگرس کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا خوب موقعہ ہاتھ آیا۔

(۱۹)

کانگریس نے پلٹا کھایا

جس وقت کانگریس نے غیر جانبداری کی وہ پالیسی اختیار کی تھی جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس وقت انصاری مرحوم زندہ تھے۔ اور تصدق احمد خاں شروانی مرحوم بھی۔ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے اثر کی بدولت غیر جانبداری کی قرارداد کانگریس کی مجلس عاملہ نے منظور کی تھی۔ سیاسی نوعیت کا پروپگنڈا ہندو مہاسبھا کی طرف سے کیا گیا۔ ہمیں اس بارے میں کوئی ذاتی معلومات نہیں۔ اس لئے کوئی قطعی بات کہنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ بہر حال ہمیں واقعات کے بیرونی رخ ہی سے غرض ہے۔ ہمیں اندرونی نبض شناسی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کا واقعات کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

۱۹۳۵ء ہی کا وہ سال تھا جبکہ انگلستان کی پارلیمنٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ ۱۹۳۵ء زیر بحث آکر منظور ہوا اور ملک معظم نے اس پر دستخط کر کے اسے قانون کی کتاب کا جزو بنا دیا۔ ان دنوں مختلف جماعتوں کو انتخابی مہم اپنے سامنے نظر آتی تھی۔ اس لئے وہ کامیاب نتائج پیدا کرنے کی متمنی تھیں۔

ہندو مہاسبھا کا انتخابی حربہ

ہندو مہاسبھا کے پاس کوئی خاص انتخابی حربہ نہ تھا جسے وہ کانگرس کے مقابلے پر استعمال کر سکتی۔ سوائے ایک حربے کے۔ یہ حربہ کانگرس کی اس حکمت عملی پر بے پناہ حملہ تھا جو اس نے وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق اختیار کر رکھی تھی۔ غیر جانبداری کے فارمولا کے اثرات واضح طور پر ہندو قوم کے سامنے آچکے تھے۔ وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

بنگال کانگرس کا رویّہ

اس معاملے میں بنگال کی صوبہ کانگرس بھی مہاسبھا سے کامل اتفاق رائے رکھتی تھی۔ وہ فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف تو تھی ہی مگر وہ کانگرس کی سرکاری مرکزی حکمت عملی کے بھی سخت خلاف تھی۔ چنانچہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۵ء اور اس کے بعد کی تاریخوں میں بنگال پولٹیکل کانفرنس کا اجلاس شری یت اندر نرائن سین گپتا کی صدارت میں ہوا۔ صاحب صدر نے اپنے خطبے میں فرقہ وارانہ فیصلے کی سخت مذمت کی۔ اور فقط اپنا زاویہ نگاہ ہی پیش نہ کیا۔ بلکہ مسٹر سبھاش چندر بوس کے وہ الفاظ بھی نقل کئے۔ جو انہوں نے یورپ کے مرتمام جنیوا سے لکھ کر بھیجے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے:۔

"جہاں تک فرقہ وارانہ فیصلے کا تعلق ہے، ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ بنگال کے کانگرسیوں میں اس کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ ہر کانگرسی اس کو

منافی قومیت۔ منافی انصاف اور منافی جمہوریت خیال کرتا ہے اور یہ رائے رکھتا ہے کہ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ اس کو بھی مسترد کر دیا جانا چاہئے۔"

مسٹر بوس کے اس اظہار خیال کے بارے میں ہمیں فقط یہ گزارش کرنا ہے کہ مسٹر بوس اور ان کے ہمنوا ہندو جو رویّہ اختیار کر رہے تھے، بنگال کے مسلمان اس سے متفق نہ تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو لیڈر جب کانگریس کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو وہ بسا اوقات "ہندو کانگریس" مراد لیتے ہیں باقیوں کو نظر انداز کر دینا آسان سمجھتے ہیں۔

کانفرنس کی قراردادیں

بنگال پولیٹیکل کانفرنس میں جو قراردادیں منظور ہوئیں ان میں سے دو کے متعلق ہی ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ ایک قرارداد تو فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق تھی جس کا مضمون یہ تھا

"اس کانفرنس کی پُر زور رائے ہے کہ برطانوی حکومت کا فرقہ وارانہ فیصلہ بیّن طور پر منافی قومیّت، منافی انصاف اور منافی جمہوریت ہے اور اس کو لازماً نامنظور کیا جانا چاہئے۔ یہ کانفرنس آل انڈیا کانگریس کمیٹی پر زور دیتی ہے کہ وہ اس قرارداد کے مطابق اپنے رویّے میں تبدیلی پیدا کرے اور یہ کانفرنس آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کرتی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔"

یہ قرارداد اپنی تشریح آپ ہے۔ فقط اتنا یاد دلانا مناسب ہے کہ ۱۹۳۲ء کے دسمبر میں بنگال کے ہندوؤں ہی نے فرقہ وارانہ کوششوں کو توڑ دیا تھا۔ اور اب وہی ہندو بنگال پھر فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کر رہا تھا۔

بنگال کے مسلم کانگریسی

بنگال کے مسلمان کانگریسی بھی اس کانفرنس میں شامل تھے جب اس قرارداد پر بحث

آئی تو مولانا عبدالباقی نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور کہا اگر اس قرارداد کو منظور کرنے پر زور دیا گیا تو مسلمان اس کی تائید نہ کریں گے بلکہ وہ بطور احتجاج کانفرنس سے واک آؤٹ کر جائیں گے۔ بنگال کے ہندو کانگریسیوں نے کانگریسی مسلمانوں کی کوئی پروا نہ کی۔ اس لئے مسلم کانگریسی سب کے سب اس ریزولیوشن کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کانفرنس سے اُٹھ آئے۔

دوسری قرارداد

اگرچہ دوسری قرارداد کا موضوع مختلف ہے۔ لیکن اس مرحلے پر ہم اس کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں فرقہ وارانہ سمجھوتہ اور مخلوط انتخاب کے ایک اور فارمولے کو ٹھکرایا گیا ہے۔ آخیر فروری ۱۹۳۵ء میں دہلی میں مسٹر جناح اور ڈاکٹر راجندر پرشاد میں فرقہ وار سمجھوتے کے متعلق ایک مرتبہ پھر بات چیت ہوئی جس میں طے ہوا کہ مسلمانوں کے ووٹوں کی تعداد کافی کر دی جائے تاکہ مخلوط انتخاب میں مسلمان بالکل خسارے میں نہ رہیں۔ بنگال پولٹیکل کانفرنس کے صدر نے بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کانفرنس نے اس بارے میں حسب ذیل قرارداد منظور کی :۔

"اس کانفرنس کی رائے ہے کہ مسٹر جناح اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے درمیان دہلی میں جو گفت گوئے اتحاد فرقہ وارانہ سمجھوتے کے متعلق ہوئی ہے اس کی طے کردہ شرائط بالکل غیر تسلی بخش اور ناقابلِ قبول ہیں اور یہ کانفرنس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بنگالی ارکان پر زور دیتی ہے کہ ان شرائط پر فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لئے جو قرارداد بھی پیش ہو وہ اس کی مخالفت کریں۔"

گویا بنگال کی صوبہ کانگریس یہ کہہ رہی تھی کہ ہم سمجھوتے کی کوئی بات نہ مانیں گے۔

لیکن آل انڈیا کانگرس کو پھر بھی کوئی حل تلاش کرنا چاہیئے۔
بنگال کے متعلق ایک اور بات کہہ کر روئے سخن کو دوسری طرف پھیرنا مناسب ہے۔
بنگال کے کانگرسیوں نے انتخاب سے کافی عرصہ پہلے آل انڈیا کانگریس کو پھر صاف صاف الٹی میٹم دیدیا کہ اگر اس نے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق اپنا رویہ بدلا تو بنگال میں کوئی اُمیدوار مرکزی کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑا نہ ہوگا بلکہ غیر جانبداری کی پالیسی کی مخالفت کرنے کا عہد کرتے ہوئے ہر بنگالی کانگرسی مرکز سے اختلاف کرتا ہوا انتخاب لڑیگا۔

مرکزی کانگرس کی تبدیلیٔ راہ

جوں جوں انتخاب قریب آیا ہندو مہاسبھا اور بنگال کانگرس کا نقطۂ نگاہ زور پکڑتا گیا۔ اس آگ کو پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی جیل کے اندر سے ہوا دی۔ ان کے بیانات اخباروں میں شائع ہوئے جن میں انہوں نے کہا کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے بارے میں غیر جانبداری کی حکمت عملی میری سمجھ میں نہیں آئی اور اس کی پُر زور مخالفت ہونی چاہیئے۔
جب پنڈت جی رہا ہوئے تو ان کو کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ان کی رائے اثر پزیر ہونے لگی۔ ڈاکٹر انصاری فوت ہو چکے تھے۔ اگر ان کا کوئی اثر پہلے فیصلے کے وقت موجود تھا تو اب وہ موجود نہ تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا وجود گرامی کانگرس کے مشوروں میں شریک عمل تھا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا انتخابی منشور

۲۲ اور ۲۳ اگست ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں وہ منشور یا مینی فیسٹو تیار کیا گیا جو کانگرس کی طرف سے انتخابی مہم کی بنیاد بننے والا تھا۔ اس منشور کی عبارت صاف اور واضح طور پر ظاہر کرتی تھی کہ کانگرس

اپنی غیر جانبداری کی حکمت عملی کو ترک کر کے نیا اقدام کر رہی ہے ۔ انتخاب کے زمانے میں ایسا کرنے سے پنڈت جواہر لال نہرو نے اور ان کے ساتھ کانگرس نے ہندو مہاسبھا کے ہاتھوں سے وہ حربہ چھین لیا جس سے وہ کانگریس پر وار کرنے کے درپے تھی ۔ گویا کانگرس نے ہندو مہاسبھا کی پالیسی کو اپنا لیا اور اب اسے نباہنے کے لئے میدان میں نکلی ۔ کانگرس کا یہ نیا راستہ تھا جس نے اسے چھ صوبوں میں اکثریت دلائی ۔ ورنہ ہندو مہاسبھا کے مقابلہ میں انتخابی مہم میں اس قدر کامیابی شاید کم ہی ہوتی ۔

منشور کا متعلقہ حصّہ

اب ہم کانگرس کے اس منشور کے متعلقہ حصّے کو نقل کرتے ہیں :-

"فرقہ وارانہ فیصلہ جسے نئے ایکٹ کا جزو بنا دیا گیا ہے بہت بحث و مباحثے کا موجب ہوا ہے ۔ اور بعض لوگوں نے اس کے متعلق کانگرس کی پوزیشن کو غلط سمجھا ہے ۔ نئے ایکٹ کو کلیتہً مسترد کرنے ہی میں فرقہ وار فیصلے کا مسترد ہونا لازماً مضمر ہے ۔ تمام ایکٹ سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی فرقہ وارانہ فیصلہ کلیتہً ناقابلِ قبول ہے ۔ کیونکہ یہ آزادی اور اصول جمہوریت کے منافی ہے ۔ اس سے علیحدگی اور انتشار کے رجحانات ترقی پاتے ہیں ۔ یہ حسب معمول ترقی کو روکتا ہے ۔ اور ہندوستانی اتحاد کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتا ہے ۔ ہندوستان کا کوئی فرقہ یا جماعت اس سے حقیقی معنوں میں فائدہ نہیں اٹھا سکتی ۔ کیونکہ اس سے جو نقصان مجموعی طور پر سب کو پہنچتا ہے ۔ وہ اس حقیر نفع سے بہت زیادہ ہے جو بعض کو پہنچتا ہے ۔ انجام کار شاید یہ انہیں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچائے گا جنہیں اس سے فائدہ پہنچانا مطلوب ہے ۔ جس فریق کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے ۔ وہ تیسرا فریق ہے جو حکومت کرتا ہے اور نفع گیری کا دم بھرتا ہے ۔

اس لئے کانگرس کا رویّہ لاتعلقی یا غیر جانبداری کا نہیں ہے۔ وہ (کانگرس) فرقہ وارانہ فیصلہ کی پُرزور مذمت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اسے ختم کردے۔ لیکن کانگرس نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا تسلّی بخش حل بڑے فرقوں کی باہمی خوش دلی اور تعاون سے ہی ہو سکتا ہے ......"

فیض پور کانگرس

۲۷ر اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو جب فیض پور میں کانگرس کا سالانہ اجلاس مہاراشٹر کے علاقے میں ہوا۔ تو وہاں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:۔

"یہ کانگرس آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے انتخابی منشور کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ان اُمیدواروں سے جو اس کے نام پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی انتخابی مہم کو اس منشور کے مفہوم کے عین مطابق چلائیں۔ اور انتخاب کے بعد مجالس قانون ساز میں بھی اسی کے مطابق عمل کریں۔"

مولٰنا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور پنڈت جواہر لال نہرو

اس مرحلہ پر مجھے اس خط و کتابت کا ذکر کرنا ہے۔ جو ان دنوں مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ہوئی۔

کانگرس کے اس بدلتے ہوئے رویّہ سے متاثر ہو کر مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنے بیانات اور تقریروں میں اس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ یہ نکتہ چینی پنڈت جواہر لال نہرو کے نوٹس میں آئی۔ اور انہوں نے ایک مکتوب کے ذریعے مولانا کو لکھا کہ انہیں کانگرس کی پالیسی کے متعلق کیا شکایت ہے؟

مولانا حبیب الرحمٰن نے جواب میں لکھا کہ کانگرس نے فرقہ وار فیصلہ کے متعلق جو رویّہ

پہلے اختیار کیا تھا۔ وہ ۱۹۳۶ء میں بدل دیا گیا ہے۔ اور اس تبدیلی میں پنڈت جی کا ہاتھ ہے۔ اس لئے شکایت پیدا ہوئی ہے۔

پنڈت جی نے جواب میں پھر لکھا کہ جہاں تک میں سمجھا ہوں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگر وضاحت سے بتایا جائے کہ کیا تبدیلی ہوئی ہے اور بات سمجھ میں آجائے تو پھر کچھ کہا جا سکے۔

اس مضمون کا خط آئے پر ان کو جواب میں لکھا گیا۔ کہ جب کانگرس نے غیر جانبداری کی قرارداد ۱۹۳۴ء میں منظور کی تھی تو اس وقت پوزیشن یہ تھی کہ اگر کسی کونسل یا اسمبلی میں فرقہ وارانہ فیصلہ زیر بحث آیا تو کانگرس پارٹی غیر جانبدار رہے لیکن اب ۱۹۳۶ء میں جو پوزیشن اختیار کی گئی ہے اس کے بعد کانگرسی ممبر کونسلوں اور اسمبلیوں میں آئندہ فرقہ وار فیصلہ کی بحث کے متعلق غیر جانبداری کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتے بلکہ وہ اس کی مخالفت میں تقریریں کرنے اور رائے دینے کے پابند ہیں۔

اس مضمون کا خط روانہ کرنے کے بہت عرصہ بعد تک مولانا حبیب الرحمن صاحب جواب کے منتظر رہے لیکن کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ حتیٰ کہ زمانہ اور کا اور ہو گیا۔

میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ خطوں کا یہ مضمون میں نے اپنی یادداشت سے تحریر کیا ہے۔ اور یہ نفس مضمون کے مطابق ہے۔ لیکن حرف بحرف وہی نہیں مولانا حبیب الرحمن صاحب جیل میں ہیں اور میں انسے اصل مسودات حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ خط و کتابت انگریزی میں ہوتی تھی۔ اور ان کو میں ہی پنڈت جی کے خط پڑھ کر سمجھاتا تھا۔ اور ان کی طرف سے انگریزی میں مسودہ خطوط تیار کرتا تھا۔ اس لیے خط و کتابت کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں موجود رہا۔

(۲۰)

ترتیب وزارت کے مراحل

کانگرس جب انتخابات کی مہم میں سرگرم تھی تو اس وقت اس کو اپنی اس قدر کامیابی کی توقع نہ تھی جس قدر کہ انتخابات کے نتائج شائع ہونے پر ظاہر ہوئی۔ مثال کے طور پر مجھے ذاتی علم ہے کہ یو۔پی کی انتخابی تاریخوں سے پہلے جب میں خود لکھنؤ اور یو۔پی کے دوسرے حصوں میں انتخابی تقریروں کے لئے گیا تو لکھنؤ میں کانگرسی کارکنوں سے گفت گو کا موقعہ ملا۔ جس روز میں نے لکھنؤ میں تقریر کی اُسی روز مجھ سے پہلے ڈاکٹر راجندر پرشاد جی تقریر فرما چکے تھے۔ مجھے دورانِ گفتگو میں معلوم ہؤا کہ لکھنؤ کے کانگرسی حلقے یو۔پی میں ایک سو نشستوں میں کامیابی کی اُمید لگائے ہیں اور وزارت بنانے کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک کے خواہش مند ہیں۔ چونکہ کانگرسی لیڈر بھی کانگرس کے پلیٹ فارم سے غیر کانگرسی مسلمانوں کے مقابلہ میں مسلم لیگ کے اُمیدواروں کو ووٹ دینے کے لئے کہتے تھے جیسا کہ لکھنؤ میں کیا گیا۔ اس لئے کانگرس اور مسلم لیگ کے اشتراکِ عمل کی داستان ہر فرد بشر کی زبان پر تھی۔ مگر میں

یہ نہیں کہہ سکتا کہ فی الحقیقت کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اشتراک عمل کا کوئی فیصلہ یا اس کے متعلق کوئی ابتدائی گفت گو بھی کی تھی یا نہیں۔ بہرحال کانگرسی حلقوں میں مسلم لیگ سے اشتراکِ عمل کی گفت گو کوئی گفتگوئے راز نہ تھی۔

کانگرس کی کامیابی کے بعد

جب کانگرس کو انتخابات میں چھ صوبوں میں بہت کامیابی ہوئی تو ہوا کا رُخ بدلا پھر اشتراکِ عمل کی گفت گو ناپید ہوگئی اور کانگرس نے وزارتوں میں نہ صرف اشتراکِ عمل ناپسند کیا بلکہ اس نے گورنروں سے عہد لینے کی ٹھانی کہ وہ وزارت کے عام کاموں میں مداخلت نہ کریں۔

اگر کانگرس نے ابتدا ہی سے وزارتیں سنبھالنے اور دوسری پارٹیوں سے مل کر وزارت بنانے کا فیصلہ کرلیا ہوتا تو غالباً وہ بنگال اور آسام میں بڑی آسانی سے وزارتیں بنا سکتی اور شاید سندھ اور سرحد میں بھی اسے وزارت میں حصّہ مل سکتا۔ لیکن وہ اب اشتراکِ عمل کو ہرگز مناسب نہ سمجھتی تھی بلکہ ان صوبوں میں جہاں کانگرسی ارکان کی تعداد کسی دوسری پارٹی سے کم ہو وہاں وہ چھوٹی پارٹی ہونے کی حیثیت سے وزارت میں چھوٹے بھائی کا حصّہ لینے کو تیار نہ تھی۔ چنانچہ سندھ میں بعدازاں ایسی وزارتیں بنیں جن کو کانگرس کی تائید حاصل رہی اگرچہ کانگرس نے اپنی تائید سے وزارتیں بنا کر ان کو اپنی مرضی مطابق چلانا پسند کیا لیکن ان میں شامل ہوکر کام کرنا گوارا نہ کیا۔ خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کا ہر مرتبہ یہی حال رہا۔

چونکہ کانگرس نے اپریل ۱۹۳۷ء میں وزارتیں قائم کرنے سے پہلے گورنروں سے عہد طلب کیا تھا کہ وہ وزارت کے آئینی کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس لئے چار ماہ تک معاملہ کھٹائی میں پڑا رہا۔

کانگرس اور حکومت دونوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً بیان شائع ہوتے رہے۔ آخر ۲۱ جون کو وائسرائے نے ایک طویل بیان شائع کیا جس سے کانگرس اور حکومت کے درمیان اشتراکِ عمل کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور وہ وزارتیں مستعفی ہونے لگیں جنہیں نقلی وزارتوں کی شکل میں اپریل میں کئی صوبوں میں قائم کیا گیا تھا۔

وزارتوں کی تشکیل

مسلم لیگ کے ارکان سے کانگرس کی وزارتوں میں شامل ہونے کی گفت گوئیں ہوئیں اور یو۔ پی میں یہ گفت گو کافی تلخی کا باعث ہوئی۔ لیکن اب کانگرس اس بات کی خواہش مند تھی کہ جو بھی وزارت میں شامل ہو وہ کانگرس کے عہد نامے پر دستخط کر کے کانگرس کے حکم کے مطابق کارروائی کرنے کا پابند بنے۔

ہندو مسلم کش مکش

چونکہ کانگرس نے بحیثیت جماعت مسلم لیگ کو بحیثیت جماعت اشتراکِ عمل کی دعوت نہ دی۔ اس لئے کانگرس اور مسلم لیگ میں تعاون نہ ہو سکا۔ لیکن کانگرس کو مختلف صوبوں میں مسلم وزیروں کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بہار میں تو یہ گنجائش تھی کہ ڈاکٹر محمود صاحب ایک حلقے سے کانگرس ٹکٹ پر منتخب ہو کر آچکے تھے۔ اور یو۔ پی میں مسٹر رفیع احمد قدوائی گو عام انتخاب میں ناکام رہے تھے مگر بعد میں ایک جگہ خالی ہونے پر بلا مقابلہ منتخب ہو کر آئے تھے اس لئے ایک وزارت ان کے حصے میں آگئی۔ یو۔ پی میں دوسرے مسلمان وزیر کی ضرورت تھی۔ اور بمبئی، سی۔ پی اور اوڑیسہ میں مسلم وزیروں کی تلاش تھی۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن صاحب مسلم لیگ کانگرس ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اس لئے ان کا وزارت میں لیا جانا آسان تھا۔

یو۔پی کی وزارت

یو۔پی میں دوسرے مسلمان وزیر کے تقرر کی خواہش تھی اس لئے کانگرس پارٹی سے باہر تلاش ہونے لگی۔ قرعہ فال حافظ محمد ابراہیم صاحب کے نام پر پڑا جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ وہ مسلم لیگ پارٹی سے علیحدہ ہو کر کانگرس میں شامل ہو گئے۔ اور وزارت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مسلم لیگ نے ان سے مستعفی ہو کر از سر نو انتخاب لڑنے کا مطالبہ کیا۔ حافظ صاحب نے ابتدا میں تو استعفے نہ دیا۔ مگر بعد میں استعفا دے کر کانگرس ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔

بمبئی کی وزارت

بمبئی میں کوئی مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب نہ ہُوا تھا اس لئے باہر سے وزیروں کی تلاش ہونے لگی۔ مگر میں یہاں یہ بات کہہ دوں کہ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس کی پارلیمنٹری کمیٹی کے رُکن تھے اس لئے مُسلم وزیروں کی تلاش کا کام انہیں کے سپرد ہُوا۔ صوبہ بمبئی میں مسٹر یاسین نوری ایک حلقے سے بطور آزاد اُمیدوار کے کامیاب ہوئے۔ آزاد اُمیدواروں کو آسانی ہوتی ہے کہ جدہر چاہیں چلے جائیں۔ اس لئے وہ وزارت میں لے لئے گئے۔ اور اُمیدوار بھی تھے جو کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن ان کو وزارت میں لینا پسند نہ کیا گیا۔ اور بمبئی میں دو مسلمان وزیر مقرر کرنے کی سکیم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ کوئی دوسرا حسب منشا وزیر مل نہ سکا۔

سی۔پی کی وزارت

صوبجات متوسط میں مسٹر شریف کو ابتداءً وزیر مقرر کیا گیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد ان سے اختلاف پیدا ہُوا۔ اور گو انہوں نے کانگریس کے ساتھ رہنے اور وزارت کو قبضے میں

رکھنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ان کی کوئی پیش نہ گئی۔

اوڑیسہ کا معاملہ

اوڑیسہ کی وزارت کا معاملہ مسلم ہندوستان کے لئے باعثِ عبرت تھا اور یہاں سے اس تکبّر اور نخوت کا آغاز ہؤا جس نے کانگرس کو مسلمانوں کی نگاہ میں پہلے سے بھی زیادہ مشتبہ بنا دیا۔ اس صوبہ میں مسلمانوں کی نمایندگی آبادی اور اسمبلی میں کم تھی۔ اس لئے یہاں کانگرس نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی مسلمان کو وزارت میں نہ لیا جائے۔ دو شخصوں نے وزارت میں شامل ہونے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن ایک کے متعلق تو کہا گیا کہ وہ نااہل ہے اور دوسرے کے متعلق کہا گیا کہ یہ کانگرس کے خلاف انتخاب لڑکر کامیاب ہؤا ہے اس لئے اس کو وزارت میں نہیں لیا جا سکتا۔

اس رعونت کی تہ میں کیا بات تھی؟ یہ طرزِ عمل کسی معمولی بنا پر نہ تھا۔ اس کی تہ میں ایک اصول قائم کرنے کی اُمنگ تھی۔ مسٹر جناح نے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی طرف سے مطالبے پر مطالبہ کر رکھا تھا کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو کابینہ وزارت میں ایک تہائی نمایندگی دی جائے۔ اس لئے کانگرس کے رہنما اور اڑیسہ کانگرس پارٹی کے لیڈر اوڑیسہ میں اس مطالبے کی دھجیاں اُڑا کر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا کوئی دباؤ حکومت اور اوڑیسہ کے گورنر کو مائل نہیں کر سکتا کہ وہ کانگرس کی بات ٹھکرا دے۔ اس لئے وہ اس اصول کو قائم کرنا چاہتے تھے کہ مسلم اقلیّت کے صوبوں میں کسی مسلمان وزیر کا لیا جانا کچھ ضروری نہیں۔ چنانچہ انہوں نے بضد ہو کر اس اصول کو منوایا اور گورنر جو عہد کر چکے تھے کہ وزارت کے عام آئینی کاموں میں دخل نہ دینگے۔ اس کی پابندی کرتے ہوئے اڑیسہ کے گورنر نے کانگرس کی خالص ہندو وزارت کو منظور کیا اور مسلمانوں کو ٹکے سا جواب دیدیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی اسی صورتِ حال کی تائید کرنا پڑی۔ یہ حالات ایسے نہ تھے کہ ان حالات میں کانگرس مسلمانوں میں ہر دلعزیز ہوسکتی۔

کانگرسی لیڈروں کی غلط فہمی

کانگرسی لیڈر ایک غلط فہمی میں مبتلا تھے کانگرس کو انتخابات میں چھ صوبوں میں جو کامیابی ہوئی وہ اس کامیابی کے نشے میں تھی۔ کانگرسی لیڈر یہ سمجھے تھے کہ ان کی کامیابی رائے دہندوں تک پہنچنے سے ہوئی ہے۔ اس لئے رائے دہندوں تک پہنچنا کافی ہے اور مسلمانوں میں بھی رائے دہندوں تک پہنچنے سے ہوسکتی ہے۔ اس لئے اوپر کے مسلم رہنماؤں کو جواب دے کر براہِ راست مسلم رائے دہندوں سے بات چیت کی جائے تو کام بن سکتا ہے۔

پنڈت جواہر لال کا نظریہ

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹ مارچ ۳۷ء کو دہلی کانگرس کنونشن کے موقعے پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران میں کہا تھا:۔

"انتخابات ہمیں بہت سے سبق سکھا رہے ہیں۔ لیکن سب سے نمایاں سبق یہ ہے کہ جہاں ہم عوام تک براہِ راست گئے وہاں ہم نے عظیم الشان فتح حاصل کی۔"

لیکن پنڈت جی اور ان کے ساتھی اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ انہوں نے ہندو تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کے ذہن کو اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی۔ اور ہندو مہاسبھا کے ہاتھ سے اس کا اکلوتا ہتھیار چھین کر اپنا یا۔ جو بات انہیں ہندوؤں میں مقبول بناتی ہے وہی ان کو اور ان کے مسلم ساتھیوں کو مسلمانوں میں بدنام اور غیر ہر دلعزیز ٹھہراتی ہے۔

چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگرس کی مُسلم عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی سکیم کو جو نمایاں ناکامی ہوئی۔ اس پر تبصرہ کرنا غیر ضروری ہے، کانگرس وزارتیں بنانے کے بعد مسلمانوں میں زیادہ ناکام ہوئی۔ اور مسلمانوں میں اثر پیدا کرنے کی کوششیں رائیگاں ثابت ہُوئیں۔

مسلم لیگ کی ترقی قوّت

الغرض کانگرس کے پارلیمنٹری کام اور حکمت عملی نے ہی مسلمانوں میں کانگرس کو مطعون اور مسلم لیگ کو مقبول بنانا شروع کیا۔ مسلم لیگ کے ساتھ وزارتوں میں اشتراک عمل کرنے سے انکار کرنے کے بعد کانگرسی لیڈروں نے مسٹر جناح سے فرقہ وارانہ سمجھوتے کی باتیں شروع کیں۔ شاید ان کو یہ خیال تھا کہ اوڑیسہ میں مسلم مطالبات کے علانیہ ٹھکرائے جانے کے بعد مسٹر جناح کا دماغ درست ہو گیا ہو گا۔ اور اب وہ دبک کر سر جھکا دیں گے۔ لیکن ایسے خیالات اگر کہیں تھے۔ تو وہ سراسر بے بنیاد ثابت ہوئے۔

اس دوران میں ہندوستان کے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ عام انتخابات کے زمانے میں مختلف صوبوں میں قدامت پسند لوگوں کی غیر فرقہ وارانہ پارٹیاں انتخاب میں حصّہ لے رہی تھیں۔ مثلاً پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور یو۔ پی میں نیشنل اگریکلچرسٹ پارٹی۔ ان پارٹیوں کے مسلمان لیڈر عام انتخاب میں مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ سر فضل حسین اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک مسٹر جناح کے ساتھ تعاون پر آمادہ نہ ہوئے۔ اور نواب چھتاری بھی ان سے آخری دم تک انتخابی جنگ لڑا کئے۔ سر فضل حسین کے بعد سر سکندر حیات نے بھی مُسلم لیگ کی مخالفت میں ہی انتخابی مہم لڑی۔

مختصر یہ کہ بنگال، پنجاب، سندھ، آسام اور سرحد میں جہاں اپریل ۱۹۳۷ء میں ہی آئینی وزارتیں بنیں، کوئی وزیر اعظم مسلم لیگ کا حامی نہ تھا۔ مسٹر فضل الحق، سر سکندر حیات،

سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ سر سعد اللہ اور سر عبد القیوم سب کے سب لیگ سے ٹکرا کر برسر اقتدار آئے تھے۔ اور فقط بنگال میں گورنر کو مسلم لیگ کے ارکان کو وزارت میں لینے کی ضرورت پڑی تھی۔ کیونکہ وہاں اس کے بغیر وزارت کا بننا اور چلنا مشکل تھا۔

لیکن ایک برس کے اندر اندر یہ سب لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ایسا کیوں ہؤا؟ کیا ان کو اپنی کوئی ایسی غلطی نظر آئی۔ جس کے سبب سے یہ سب کے سب یکایک تائب ہو گئے۔ کیا ان کو مسٹر جناح میں کوئی خاص خوبی نظر آئی۔

عقیدے کی تبدیلی کا باعث

یہ حقیقت تو کسی پر پوشیدہ نہیں کہ ان سب صوبوں میں کانگرس پارٹی ہی حزب مخالف کا کام کر رہی تھی۔ اس لئے اس کے ساتھ آئینی تصادم ہو رہا تھا۔ مگر مشترکہ اصولوں کی بنا پر بنائی مشترکہ پارٹیاں کمزور کیوں ہو گئیں۔ اور مسلم لیگ میں یہ سب وزیر اعظم کیوں شامل ہو گئے؟

میں اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہوں۔ کہ کانگرس کی مخالفت ان لوگوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے نئے معاون تلاش کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن انہیں سب سے زیادہ ضرورت ہندوؤں کی تھی۔ جو کانگرس سے علیحدہ ہو کر ان کے ساتھ آئیں پھر مسلم لیگ کو تقویت دینے کی بجائے مشترکہ پارٹیوں کو تقویت دینا زیادہ مفید ہوگا۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت خود ہی ہندوؤں کی کانگرس پرستی سے مرعوب ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ آئندہ ہندوؤں کی کوئی جماعت ہندوؤں میں کانگرس کو شکست نہ دے سکے گی۔ اور اس طرح برطانوی اقتدار کی مفید معاون نہ بن سکے گی۔ اس لئے اسے ایک ایسی پارٹی کی ضرورت تھی۔ جو ہندوستان کو دو حصوں میں بہر حال تقسیم کر سکے

اس مقصد کے لئے مسلمانوں کو یکجا کرنا آسان تھا۔ اور ہر صوبہ میں مسلم وزرائے اعظم کی ذمہ داریاں انہیں ایسا کرنے پر مائل کر سکتی تھیں۔ اس لئے مناسب مشوروں کے بعد مسلمان وزرائے اعظم اور ان کے ساتھیوں کو اجازت یا حکم ملا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوں۔ اور اس کو تقویت پہنچائیں۔

کانگرس کا رویہ مسلمان کو ناراض کر ہی چکا تھا اور روز بروز ناراضی کو بڑھا رہا تھا اس لئے مسلم لیگ کے اقتدار میں یکایک گرانقدر اضافہ ہونا مشکل نہ تھا۔ کانگرسی لیڈر بھی مسلم لیگ سے سمجھوتے کی نئی گفتگوئیں کرنے کے درپے تھے اور اس طرح مسلمانوں کی نظروں میں اسے ہی قابلِ التفات بناتے تھے۔ حکومت اور کانگرس کے متضاد مقاصد مگر متوازی طرزِ عمل نے مسلم لیگ کو مسلم عوام اور خواص میں مقبول بنایا۔ اور مسٹر جناح کو مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ کا منصبِ جلیل عطا فرمایا۔

چونکہ ہم یہاں فقط آئینی مسائل پر بحث کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم نے دانستہ یہاں ان دوسرے مسائل کا ذکر نہیں کیا جن کی بدولت مسلم لیگ کو مسلمانوں میں کامیابی حاصل ہوئی یا عام مسلمانوں کا ذہن کانگرس سے برگشتہ ہوا۔ ان مسائل کے متعلق اس سلسلہ مضامین کے بعد علیحدہ بحث کی جائے گی۔

(۲۱)

پاکستانی ذہن کا عروج

گزشتہ مضامین میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ فیصلے کے آئینی پہلو پر تبصرہ کرنے کے بعد اب موضوع وبحث کی ضرورت تقاضا کرتی ہے کہ پاکستان کی ابتدا و عروج کا ذکر کیا جائے

ابتدائی گزارشات

مگر اس سے پیشتر کہ میں پاکستان کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالوں، سب مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس نئی تحریک پر غور کرتے وقت اس بات کو بھول جائیں کہ ہم کہاں سے کہاں تک پہنچے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا جب مسلمان موجودہ ہندوستان کے اکثر مقامات پر صدیوں تک حکومت کرتے رہے۔ اس وقت پاکستان یا اس قبیل کا کوئی اور لفظ اس ملک کے لئے استعمال کرنا کسی کو مناسب نظر نہ آیا۔ جب سیاسی اقتدار اپنے ہاتھوں میں ہو تو ناموں کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی کیونکہ اس وقت پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جب ہم نے اپنی کمزوریوں، سہل انگاریوں اور آرام طلبیوں کی بدولت حکومت کو آہستہ آہستہ ہر حصّہ ملک سے گنوا لیا تو ہم میں سے کچھ نہ کچھ لوگ ہندوستان میں پھر اسلامی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے اور انہوں نے نئی آنے والی حکومت انگریزی سے قطع تعلق، عدم تعاون اور واپسی اقتدار کی حکمت عملی پر عمل کیا۔

ہم میں کچھ لوگوں نے جو اس حکمت عملی پر کاربند ہونا مضر سمجھنے لگے اس کی مخالفت کی اور انگریزی حکومت سے تعاون کر کے دفاتر حکومت میں نوکریوں کا حصّہ تلاش کرنا شروع کیا۔ اس رویّے کا لازمی اثر یہی ہونا تھا کہ ملک بھر میں برطانوی حکومت کی مخالفت کا جذبہ کم ہو جائے اور مسلمان اسلامی حکومت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے کے ناقابل سمجھ کر اس خیال ہی کو ترک کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور طول و عرض ہند میں کوئی ایسی تحریک نہ رہی جو سارے ملک کو اسلامی اقتدار میں لانے کی خواہش مند ہو۔

اس صورت حال نے مسلمانوں کے ایک طبقے کو ان ہندوؤں کا ہمنوا بنایا جو ہندوستان کو انگریزی حکومت سے چھڑا کر آزادی کی منزل پر پہنچانے کے دعویدار تھے ان مسلمانوں نے عالم اسلامی کی نجات اسی حکمت عملی میں دیکھی کہ کچھ ہو ہندوستان آزاد ہو جائے۔

مگر ایک طرف بیرونِ ہند کے مسلمان کی ہستی اندرونِ ہند کے مسلمان کو پیاری تھی اور دوسری طرف وہ یہاں کے ہندو کو حیران و پریشان کرنے والی تھی اس لئے قوم پرستی کے نام پر بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے پختہ رفیق نہ بن سکے۔

اب پاکستان کا خیال پیدا ہُوا ہے۔ یہ کسی فاتحانہ بلندئ عزم کا حامل نہیں۔ یہ بھی اپنے لئے گوشۂ امن تلاش کرنے کی ایک شکل ہے۔ جہاں بظاہر اطمینان سا نظر آتا ہو کہ یہاں ہماری اکثریت ہوگی۔ اور اکثریت کے ہاتھ میں حکومت ہوگی اور حکومت پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ اور ہم

آسانی سے من مانی کارروائی کر سکیں گے۔

لیکن قوموں کی زندگی کے لئے محنت اور قربانی کی ضرورت ہے جس کے بغیر روحِ حیات کو مستقل اور پائدار نہیں بنایا جا سکتا۔

علامہ محمدؒ اقبالؒ کا ابتدائی اظہارِ خیال

اوّل اوّل علامہ سر محمد اقبال مرحوم نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد مسلم کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ علاقوں میں برسرِ اقتدار ہونا چاہیئے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ علامہ اقبالؒ کو یہ خیال کیوں پیدا ہوا لیکن اتنا عرض کرنا مناسب ہے کہ ۱۹۲۸ء میں اقبال مرحوم بھی اور لوگوں کے ساتھ تجاویز دہلی کے حامی تھے لیکن جب مخلوط انتخاب کا وہ فارمولا بھی مسترد کر دیا گیا اور مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں دئے جانے کا مطالبہ بھی ٹھکرا دیا گیا تو علامہ مرحوم کے دل میں نئے خیالات کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ اگر نتیجہ یہ ہوا ہو کہ سر اقبال مرحوم ہندوؤں کے ساتھ کلی تعاون کی کامیابی سے مایوس ہو کر دونوں کے علیحدہ حلقۂ اقتدار قائم کرنے کی طرف مائل ہوئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن علامہ اقبال کی بات اسلامی ہند میں بھی صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ کسی مسلمان کی طبیعت ایسی بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ کسی نے اس کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اس کی عام مخالفت نے علامہ مرحوم کو جرأت نہ دلائی کہ وہ اس خیال کو شدت سے قوم کے سامنے پیش کرتے بلکہ بعض لوگوں نے تو کہا ہے کہ وہ بعد میں اس نظرئے کو خود ہی ترک کر بیٹھے تھے۔

چوہدری رحمت علیؒ صاحب کا پاکستان

۱۹۳۲ء میں چوہدری رحمت علیؒ صاحب نے انگلستان میں ایک تحریک کی بنیاد رکھی

جس کو پاکستانی تحریک کا نام دیا۔ پنجاب۔ افغانیہ (سرحد) کشمیر اور سندھ کے الفاظ کے پہلے حروف لئے گئے اور سب کو مشتق کر کے پاکستان نام رکھا گیا۔ پاک کا لفظ فارسی ہے جس کے معنی پاکیزگی نفس واخلاق وعمل ہیں اس لئے ان حروف والفاظ کو اپنایا جانے لگا۔

ابتداءمیں چوہدری رحمت علی صاحب نے فقط شمال مغربی ہندوستان کے اس خطے ہی کو اپنی نئی سکیم میں رکھا جس میں مذکورہ بالا صوبے یا ریاست شامل ہے۔

چوہدری صاحب کی تحریک بھی شروع میں زیادہ پسند نہ کی گئی بلکہ اس کی بھی ہر طرف مخالفت ہوئی ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کی قومی تحریک چل رہی تھی۔ فرقہ وارانہ معاملات زیر غور نہ تھے اس لئے اس تحریک کو وسیع پیمانے پر لبیک نہ کہا گیا بلکہ اس پر سوچنا بھی مناسب نہ سمجھا گیا۔ ہندوستان کے مسلمان ابھی تک ہندو مسلم مفاہمت کی اُمیدوں میں تھے اس لئے اور کسی طرف کان دھرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

بعد کی سکیمیں

اس کے بعد حکومت ہند کے ۱۹۳۵ء کے قانون کی نوبت آئی اور ۱۹۳۷ء میں نیا آئین رائج ہؤا۔ اس آئین کے رائج ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ہی سکیم پر سکیم شائع ہونے لگی۔ سید عبداللطیف صاحب کی کلچرل زونز یا تمدنی علاقہ جات کی سکیم "ایک پنجابی" کی کنفیڈریسی آف انڈیا یا ہندوستان کا دوگونہ وفاق، اور اسی طرح کی اور سکیمیں شائع ہوئیں۔ ان سب سکیموں کی بنا اس تخیل پر تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کچھ ایسے علاقے مل جائیں جن میں ان کی اکثریت ہو یا ان کو اقتدار فائق حاصل ہو۔

چوہدری رحمت علی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں پاکستان کے ساتھ بانگِ اسلام یعنی بنگال اور آسام کے علاقے اور عثمانستان یعنی حیدر آباد دکن کی ریاست کو بھی شامل کر لیا

سر سکندر حیات کی سکیم

اوروں کا تو کیا کہنا نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر سکندر حیات خاں نے بھی اپنی ایک سکیم دنیا کے سامنے پیش کی جس میں ہندوستان کو سات حصّوں میں تقسیم کرنے کا خیال ظاہر کیا گیا۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟

یہ سب کیوں ہوا۔ اس کی تہ میں کوئی خاص راز پوشیدہ نہیں وہ بات جو ۱۹۳۷ء سے پہلے کانوں کو بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ وہ ۱۹۳۷ء کے بعد سہانی معلوم ہونے لگی۔ اس لئے نہیں کہ راز آشکارا ہو چکا تھا کانگرس کی قوم پرستی سے مسلمانوں کی قوم پرستی اور ہندوستانی قومیت کی آخری اُمیدیں وابستہ تھیں مگر کانگرس نے اوڑیسہ میں اور پھر سی۔ پی میں مسلمانوں کو وزارت سے محروم کر کے آشکار کر دیا کہ وہ مسلم رائے عامہ کی پروا کرنے کو تیار نہیں مسلمانوں کو نظر آنے لگا کہ جو کچھ دو صوبوں میں ہوا ہے وہ اوروں میں بھی ہو سکتا ہے اور بالآخر مرکز میں بھی ناممکن نہیں۔

کانگرس نے کسی مسلمان جماعت سے تعاون کرنے کے اصول ہی کو قبول نہ کیا بلکہ اس کے جنرل سکرٹری نے تو مجلس احرار کو لکھنؤ کانفرنس کے موقعے پر تار ہی بھیج دیا تھا کہ مجلس احرار کو توڑ کر کانگرس میں شامل ہو جاؤ۔ وہ مسلم لیگ سے تعاون کیا کرتی اور کب تک کرتی۔ مولٰنا ابوالکلام آزاد کانگرس میں مسلمانوں کے بہترین نمائندے تھے۔ ان کے ذمّے یہ فریضہ عائد ہوا کہ وہ لکھنؤ سے لے کر بمبئی تک سفر کریں اور ایسے مسلمانوں کی جستجو فرمائیں جو مسلم جماعتوں کو چھوڑ کر کانگرس کے ساتھ رشتہ جوڑیں اور آیندہ کانگرس کے سوا اور کسی جماعت سے تعلق نہ رکھیں اور اگر کوئی مسلمان ایسا نہ ملے جو کسی مسلمان جماعت کو چھوڑ کر کانگرس میں شامل ہو تو کسی "آزاد" اُمیدوار ہی کو کانگرس کی ردائے وزارت اوڑھا دیں۔

یہ منظر کانگریسی نقطۂ نظر سے خواہ کتنا ہی پسندیدہ اور قابل فخر کیوں نہ ہو عام مسلمان اس کو مفاد اسلامی کے خلاف سمجھنے پر مجبور تھا۔ اور وہ مولانا آزاد کے رویّہ کی حمایت نہ کر سکتا تھا۔ جس طرح استعمار پسند حکومتیں اپنی ماتحت سلطنتوں میں غدّاروں کی تلاش میں رہا کرتی ہیں اسی طرح کانگرس نے اپنا رویّہ بنایا اور مسلمانوں کے دلوں میں خطرات و خدشات کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔

پھر کہیں بندے ماترم کا قصّہ۔ کہیں واردھا سکیم۔ کہیں گولیاں چلنے کے واقعات، کہیں اردو ہندی کے جھگڑے نظر آنے لگے۔

مسلم لیگ کی وزارتیں کئی صوبوں میں مرتب ہو چکی تھیں۔ سرحد میں مسلم لیگ وزارت کی جگہ کانگرس نے لی۔ اس سے باہمی کش مکش اور تیز ہوئی۔ درست اور غلط ہر طرح کا طوفانی پروپگنڈا برپا ہوا۔ لیگ کے وہ رہنما جو پاکستانی سکیموں کے قائل نہ تھے آخر اس طرف متوجّہ ہوئے۔

مسٹر جناح میں انقلاب

مسٹر جناح کی سیاسی زندگی کی ابتدا کانگرس کے پلیٹ فارم سے ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء تک وابستہ رہے۔ کانگرس سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ مخلوط انتخاب اور متحدہ ہندوستان کے خواب ہی دیکھا کئے۔ ان کی علیحدگی جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے جھگڑے پر نہ تھی اور نہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے پاکھنڈ پر۔ وہ مخلوط انتخاب کا ہمیشہ دم بھرا کئے اور ہندوستان میں متحدہ قومیت کا منظر دیکھنے کے آرزومند رہے۔ مگر ان کی کوششوں کا جو حشر ہُوا وہ قبل ازیں کافی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ مسٹر جناح کی طرح اور بہتیرے مُسلم رہنما اسی وادیٔ پُرخار سے گزر چکے تھے۔

آخر مسلم لیگ نے مسٹر جناح کی رہنمائی میں مسلمانوں کے لئے حلقہ ہائے اقتدار تلاش کرنا شروع کئے۔

ایک سکیم ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب حیدآبادی نے اس کمیٹی کے سامنے رکھی۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ۲۵ رمارچ ۱۹۳۹ء کو میرٹھ میں مقرر کی تھی اور جس میں مسٹر جناح کے علاوہ سر سکندر حیات خاں۔ سید عبدالعزیز۔ سر ناظم الدین۔ سر عبداللہ ہارون سردار اورنگ زیب خاں اور نواب زادہ لیاقت علی خاں شامل تھے۔

اس سکیم میں اسلامی وطن قائم کئے گئے تھے۔ اوّل شمال مغربی وطن تھا۔ جس میں سندھ بلوچستان۔ پنجاب، صوبہ سرحد۔ کشمیر۔ بہاول پور اور خیر پور کو شامل کیا گیا۔
دوم شمال مشرقی وطن تھا جس میں بنگال اور آسام کے اسلامی علاقے شامل کئے گئے

سوم "دلی لکھنؤ" وطن تھا۔ جس میں بہار اور یو۔ پی وغیرہ کے مسلمانوں کو اکٹھا کیا جانا پیش نظر تھا۔ اور

چہارم دکن کا وطن تھا جس میں دکن کے مسلمانوں کو جمع کیا جانا تھا۔ اور انہیں مدراس تک یا بیجاپور کے راستے مغربی ساحل تک راستہ دیا جاتا تھا۔
باقی ہندوستان ہندوؤں کا وطن بتایا جاتا تھا۔

اس اسکیم پر اعتراضات

مجھے اس سکیم پر اپنی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کرنا ہے۔ میں یہی کافی سمجھتا ہوں۔ کہ اس کے بارے میں" کانفیڈریسی آف انڈیا" یا "ہندوستان کا دوگونہ وفاق" کے مصنف کے اعتراضات درج کردوں۔ فاضل مصنف نے لکھا ہے :۔

(۱) اس سے بڑے بڑے فاصلوں پر سے ہندوستان کی دو تہائی آبادی کا تبادلہ او۔

ناقابلِ برداشت اخراجات لازم آتے ہیں۔

(۲) اس کی رو سے انگریزی علاقہ کے باشندوں کی کثیر تعداد دیسی ریاستوں میں منتقل ہوگی۔ اور اس طرح وہ جمہوری حکومت کے سایہ سے نکل کر شخصی حکومت کے آہنی چنگل میں آجائیں گے جس کے لئے ہمارے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں۔

(۳) حیدرآباد کے لئے مدراس کی بندرگاہ تک زمین کا ایک لمبا قطعہ اور بنگال کے لئے کلکتہ کے گرد و نواح میں بہت سا علاقہ طلب کیا جائے گا۔ حالانکہ یہ دونوں قطعے ہندو علاقوں میں شامل ہیں۔ اور انہیں کانگرس کی موجودگی اور ہندوؤں کی موجودگی کے پیشِ نظر حاصل کرنا کارے دارد کا مصداق ہے۔

(۴) شمال مغربی علاقے میں بہت سی نہروں کے منبع ہندو علاقوں میں آجائیں گے

(۵) ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آب و ہوا کا بے حد فرق ہے اور یہ آبادی کے تبادلہ کی صورت میں مہاجرین کے حق میں مضرت رساں ثابت ہوگا۔

ایک پنجابی کی سکیم

"ایک پنجابی" نے ڈاکٹر عبداللطیف اور دیگر حضرات کی سکیموں کے مقابلے میں اپنی سکیم پیش کی جس میں ہندوستان میں پانچ مختلف فیڈریشنوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) شمال مغربی مسلم فیڈریشن جس میں صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب، ماسوائے ہندو اضلاع کے اور بلوچستان، کشمیر اور پنجاب کی مسلم ریاستیں شامل کی گئیں۔

(۲) راجستان فیڈریشن۔

(۳) حیدرآباد۔ میسور اور بستار کا فیڈریشن۔

(۴) ہندو فیڈریشن۔

(۵) مسلم بنگال فیڈریشن

اس سکیم میں آبادیوں کے تبادلہ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ ریاستوں کو بھی بہت حد تک علیحدہ رکھا جاتا ہے۔

مجلس احرار کی ۱۹۳۹ء کی قرارداد

۱۹۳۹ء میں زیادہ تر وہی سکیمیں زبان زد خلائق تھیں جن میں آبادیوں کے تبادلہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ اور مدّت سے یہ کہا جا رہا تھا۔ کہ مسلم آبادیوں کو ایک طرف اور ہندو آبادیوں کو دوسری طرف تبدیل کر دیا جائے۔ ان حالات میں پشاور کی احرار کانفرنس میں جو اپریل ۱۹۳۹ء میں ہوئی مذکورہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"آل انڈیا احرار پولٹیکل کانفرنس کا یہ اجلاس پاکستان کے نام سے اس قسم کی تمام سکیموں کے خلاف ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے جھگڑوں میں مصروف کر کے مشترکہ جنگ آزادی سے دور کر دیا جائے۔"

"یہ اجلاس اس سکیم کو انگریزی راج کے تحفظ کے لئے خطرناک سازش یقین کرتا ہے کہ مسلمان ہندوستان کے کسی دوسرے خطے میں جا کر آباد ہوں۔ اور مساجد و مقابر کو ترک کر دینے اور برٹش انڈیا کے کسی خاص حصّے کو خالص ہندو راج قرار دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔"

"نیز یہ اجلاس اپنے اس یقین کا اعلان کرتا ہے کہ عالم اسلام کی ترقی اور خود ہندوستان کی آزادی کا واحد حل صرف یہ ہے کہ ہندوستانی اقوام شہنشاہیت کے مقابلے میں مشترکہ جنگی محاذ قائم کر کے آزاد ہندوستانی حکومت کے لئے جدوجہد کریں۔"

"نیز یہ اجلاس واضح کر دیتا ہے کہ ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی تباہ کن سکیم ہمیشہ سے

وہ ہندو یا مسلمان پیش کرتے رہتے ہیں۔ جو غیر ملکی حکومت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہتے ہیں۔ اور جن کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان کے رُخ کو جنگ آزادی سے ہٹاکر خوف و وہم اور قبل از وقت تقسیم حقوق کی بھول بھلیاں میں مبتلا رکھا جائے"

احرار کانفرنس کی اس قرارداد کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ:۔

(۱) مجلس احرار اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ آبادیوں کا تبادلہ کر کے خالص ہندو اور خالص مسلم علاقے بنائے جائیں اور مسلمان اقلیت اپنی جائداد اپنے مقابر و مساجد اور اوقاف کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں ہجرت کر جائے۔

(۲) "انگریزی شہنشاہیت کے مقابلے میں ہندوستانی اقوام کو" مشترکہ جنگی محاذ" قائم کرنا چاہیئے۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ لازماً ہندوستانیوں کو ایک قوم نہیں کہتی بلکہ وہ "مشترکہ جنگی محاذ" کی طالب ہے۔

(۳) مجلس احرار کو یہ کھٹکا ہے کہ برطانوی حکومت کے پٹھو جو ہمیشہ اس کا ساتھ دیتے ہیں جب وہ اس قسم کی باتیں کہتے ہیں۔ تو صاف شبہ ہوتا ہے کہ تہ میں حصول مقصد نہیں بلکہ برطانوی مصالح کارگر ہیں۔

(۲۲)

پاکستان - قرارداد لاہور ۱۹۴۰ء

مسلم لیگ کا رویّہ

تقسیم ہند کی مختلف سکیمیں ملک میں پیش ہو چکی تھیں وہ مسلم لیگ کے سامنے بھی آئیں۔ مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں لاہور کے اجلاس میں جو رویّہ اختیار کیا اس سے ظاہر ہے کہ اس نے آبادیوں کو کلیۃً یا کسی کثیر تعداد میں تبدیل کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے علیحدہ علیحدہ وطن بنانے کی تجویزوں کو قابلِ عمل نہ سمجھا۔ اور ان کی تائید نہ کی۔ اور اس طرح مجلس احرار کے اس اعتراض کو وزنی اور قابل قرار دیا کہ آبادیوں کا تبادلہ کر کے ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے علاقے قائم کرنے پر زور دینا قرینِ دانش نہیں۔

سالانہ اجلاس کی قرارداد

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ۲۲-۲۳ اور ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوا۔ مسٹر فضل الحق نے "شیر بنگال زندہ باد" کے نعروں کے درمیان آئینی مسائل کے متعلق وہ قرارداد

پیش کی جو پاکستان کے مسئلے سے تعلق رکھتی تھی۔ قرارداد پر بحث کرنے سے پہلے ہم اس کو نقل کر دیتے ہیں تاکہ قارئین بحث کا بخوبی لطف اُٹھا سکیں۔ قرارداد حسب ذیل تھی:۔

۱۔ "آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل اور مجلس عاملہ کی اس کارروائی کی تصدیق اور تائید کرتے ہوئے جس کا پتہ ان کی ۲۷ راگست، ۱۷، اور ۸ استمبر اور ۲۲ راکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ رفروری ۱۹۴۰ء کی ان قراردادوں سے ملتا ہے جو آئینی مسائل کے متعلق ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس از سر نو پُرزور اعلان کرتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی وفاقی سکیم اس ملک کے خاص حالات کے ناموافق اور ناقابل عمل ہے اور مسلمانانِ ہند کو قطعاً ناپسند ہے۔

۲۔ یہ اجلاس اپنے اس پُرزور نقطہ نگاہ کو ضبطِ تحریر میں لاتا ہے کہ گو ملکِ معظم کی حکومت کی طرف سے وائسرائے کا ۸ راکتوبر ۱۹۳۹ء کا اعلان اس حد تک حوصلہ افزا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیادی حکمت عملی اور خاکہ پر ہندوستان کی مختلف پارٹیوں مفادوں اور فرقوں کے مشورے سے نظر ثانی کی جائے گی تاہم مسلم ہندوستان کو اس وقت تک اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام آئینی خاکہ کو از سر نو زیر غور نہ لایا جائے اور کوئی ترمیم شدہ خاکہ مسلمانوں کو قابلِ قبول نہ ہوگا جب تک کہ وہ ان کی طرف سے تصدیق اور منظور شدہ نہ ہو۔

۳۔ قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کا یہ خوب غور کردہ خیال ہے کہ ملک میں کوئی آئینی خاکہ قابل عمل نہیں ہوگا اور نہ وہ مسلمانوں کو منظور ہوگا۔ اگر اس کو مذکورہ ذیل بنیادی اصولوں پر کھینچا نہ گیا ہو:۔

یعنی جغرافیائی حیثیت سے ملحقہ وحدتوں کو ایسے علاقوں میں جمع کر دیا جائے جو ضروری

ترمیم حدود کے بعد ایسی شکل اختیار کریں کہ وہ رقبے جن میں مسلم اکثریت ہے، مثلاً شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان کے رقبے، اکٹھے کر دئے جائیں اور وہ ایسی آزاد ریاستیں قرار پائیں جن میں شامل ہونے والی وحدتیں یا اکائیاں (یعنی صوبہ یا ریاستیں) خودمختار اور صاحبِ استقلال ہوں۔

اور ان علاقوں میں وہاں کی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق کے تحفظ کے لئے ان اقلیتوں کے مشورے سے کافی، موثر اور لازمی تحفظات آئین حکومت میں مہیا کئے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اسی طرح ان کے اور دوسری اقلیتوں کے لئے ان کے مشورے سے ان مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق کے تحفظ کے لئے کافی، مؤثر اور لازمی تحفظات آئینِ حکومت میں مہیا کئے جائیں۔

۲۔ یہ اجلاس مجلسِ عاملہ کو یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق ایک آئینی خاکہ تیار کرے جس کی بنیاد پر مختلف رقبے دفاعِ ملکی، امورِ خارجہ، ذرائع آمد و رفت، محصول درآمد اور دیگر ضروری امور کے متعلق اپنے اختیارات کو انجام کار استعمال کر سکیں۔"

اس قرارداد پر خوب تقریریں ہوئیں اور دو دن کی بحث کے بعد اس کو منظور کیا گیا۔ بحث میں مختلف صوبوں کے نمائندوں نے حصہ لیا اور سب نے بڑی شدّ و مد سے اس کی تائید کی۔ اس کی تائید کرنے والوں میں چوہدری خلیق الزمان، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر محمد عالم جیسے بزرگ بھی تھے جنہوں نے کانگرس کے متعلق اپنے تجربات و محسوسات کے قصے بھی بیان فرمائے۔ اس قرارداد کے بارے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) اس میں آبادیوں کے تبادلے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ حدود کی ترمیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قرارداد کے ذریعے ان سب سکیموں کی مخالفت کی گئی جو آبادیوں کے کافی یا کلی تبادلے کے متعلق تھیں۔

(۲) مسلم اور غیر مسلم اقتدار کے رقبے قائم کر کے ان میں مختلف حکومتیں قائم کرنا اور ان مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا پیش نظر تھا چنانچہ تقریروں اور بیانوں میں پنجاب کے سکھوں کو خاص طور پر کہا گیا کہ ان کی پوزیشن شمال مغربی مسلم رقبے میں بہت اچھی ہو جائے گی۔

ان تحفظات نے اقلیتوں کے مشورے سے ہر جگہ طے ہونا تھا۔ اور اس لئے کہیں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور کہیں ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کا فیصلہ کرنا تھا۔ یہ تجویزیں بھی آبادی کے تبادلے کے منافی ہیں۔

(۳) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی وفاقی سکیم کی کلیتہً مخالفت پیش نظر تھی۔ اور آئین حکومت کو رواجی جمہوری نظام کے مطابق بنایا جانا قابلِ قبول نہ تھا۔

(۴) سب سے اہم امر یہ ہے کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو اجلاس عام سے یہ اختیار دلوایا گیا کہ وہ مطلوبہ آئین کی سکیم تیار کر کے ملک کے سامنے رکھے۔

میرے نزدیک تو سب سے زیادہ ضروری کام یہ تھا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اس آئین کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کرتی اور اسی بات پر ہر طرف سے زور دیا جاتا کہ پہلے وہ نقشہ تو تیار کیا جائے تاکہ مطلوبہ سکیم پر اچھی طرح غور و خوض ہو سکے۔

لیکن اجلاس عام سے مجلس عاملہ کو تو یہ "اختیار" دلوایا گیا تھا کہ وہ سکیم تیار کرے۔ نکتہ یہ ہے کہ مجلس عاملہ کے ذمے یہ "فرض" عاید نہیں کیا گیا تھا کہ وہ یہ کہ سکیم تیار کرے اور اگر کرے تو کتنے

عرصہ کے اندر نتیجہ یہ ہے کہ اس قرارداد کے موافق اور مخالف ہزارہا جلسے اور تقریریں ہو چکیں اور لاکھوں من کاغذ اسی کی موافقت اور مخالفت میں سیاہ کیا جا چکا۔ مگر ابھی تک مطلوبہ سکیم کے صحیح خدّوخال لوگوں کے سامنے نہیں آئے۔

(۵) اس قرارداد میں مسلم لیگ کے ارباب دانش نے پاکستان کے لفظ کو استعمال نہیں کیا بلکہ ابتداء میں تو خیال یہی تھا کہ پاکستان کا لفظ ہی اس سکیم پر عاید نہ کیا جائے۔ چنانچہ شیر بنگال اور دوسرے لوگوں نے اپنے بیانوں میں کہا کہ اس سکیم کو پاکستان کا نام نہیں دینا چاہئیے اور نہ ہم اسے یہ نام دیتے ہیں۔ لیکن زیادہ دیر تک اس پوزیشن پر اصرار نہ ہو سکا۔ مخالفت کرنے والوں نے اسے بھی پاکستان کے نام سے یاد کیا۔ اور موافقت کرنے والے بھی پاکستان کے رواجی لفظ کو چھوڑ نہ سکے۔ بعد میں مسلم لیگ کی کانفرنسیں کئی جگہ منعقد ہوئیں جن کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ سوبرانپور سے لے کر علیگڑھ اور لکھنؤ تک اسی نام کا چرچا ہوا۔

(۶) مسلم لیگ نے پاکستان کے نظریئے کو بہت حد تک بدل دیا اور اس کی سکیم اس ذہن سے بہت دُور جا پڑی۔ جو اسلامی پاکستان دیکھنے کا متمنّی تھا۔ مگر اس نے ابتدا میں پاکستان کے لفظ کو ترک کرنے کا فیصلہ کر کے بعد میں حالات کے پیش نظر اپنا لیا۔ اور اس کا اصلی جامہ بدل کر اپنا جامہ پہنا دیا۔ گو ابھی تک اس نئے جامے کے رنگ دروپ کا بھی کسی کو زیادہ علم نہیں اور معنی فی بطن شاعر یعنی معنی شاعر کے پیٹ میں کا مصداق مفہوم کو متعین کئے بغیر موافقت اور مخالفت کا ایک دریا اُمڈتا چلا آرہا ہے۔

(۷) اس قرارداد کے بعد اس کی حمایت کرنے والوں کا آپس میں بعض مرتبہ اختلاف رونما ہؤا ہے ہو سکتا ہے کہ باہر کے لوگ اصل حال سے کماحقہٗ واقف نہ ہوں لیکن مسٹر جناح اور سر سکندر کے اختلافات کبھی کبھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔ گو سر سکندر ہی کو اس قرارداد کا بانی کہا

جاتا ہے۔ اس لئے ابھی تو یہ دیکھنا بھی باقی ہے کہ اس قرارداد کا مطلب مسٹر جناح کے نزدیک کیا ہے اور سر سکندر کے نزدیک کیا اور اب تو بنگال کے بدلتے ہوئے حالات میں اس قرارداد کو شیرانہ انداز سے پیش کرنے والے مسٹر فضل الحق بھی شاید اپنی آواز کو اس کی تفسیر میں اٹھائیں اغلب ہے کہ ان کے اور مسٹر جناح کے مابین اختلاف کا ایک جنگل رونما ہو۔

(۸) اس قرارداد کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس سے ہندوستان دو حصوں میں یا کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اس لئے اس کو منظور نہ کیا جانا چاہیئے۔

مولانا مظہر علی صاحب اظہر نے جب یہ مضمون لکھا تھا اس وقت سر سکندر حیات بقید حیات تھے اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں مولوی فضل الحق کی مسلم لیگ سے علیٰحدگی اور پھر جناح فضل الحق تصادم کی روداد سے ایک دنیا آگاہ ہے یہ سرگذشت اسی کتاب کے اگلے صفحوں پر درج ہے۔ (ناشر)

(۲۳)

پاکستان ۱۹۴۰ء میں

کانگرس کا رویّہ

مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں جو قرارداد منظور کی اس کے خلاف عام ہندو حلقوں سے آواز کا بلند ہونا کسی تعجب کا باعث نہ ہو سکتا تھا۔ جو لوگ ہندو مسلم مفاہمت کے ہر فارمولے کو ٹھکراتے آئے ہوں ان کے لئے اس نئے فارمولے پر کان دھرنا بھی دو بھر تھا۔ مگر مجھے اس وقت فقط کانگرسی رویے پر بحث کرنا مطلوب ہے۔

گاندھی جی کا اظہارِ خیال

متحدہ ہندوستان ہی ہندوستانی سیاسیات کا عام مطمح نظر رہا ہے اس لئے گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کا مسلم لیگ کی قرارداد پر لے دے کرنا قابلِ فہم نہیں۔ انہوں نے اس قرارداد کو تقسیم ہند کی قرارداد ٹھہرایا۔ اور ہندوستان کو ناقابلِ تقسیم بتایا یا کم از کم یہ کہا کہ اس کو تقسیم کرنا مناسب نہیں۔ لیکن اس قرارداد کی انتہائی مخالفت کے باوجود گاندھی جی

نے پاکستان یا تقسیم ہند کی قرارداد کا آخری فیصلہ کانگریس کی مطلوبہ نمائندہ اسمبلی پر چھوڑنے کی دعوت دی۔ ۳۰ر مارچ کو انہوں نے "ہریجن" کے ایک مضمون کے دوران میں اور باتوں کے علاوہ لکھا کہ

"نمائندہ اسمبلی کا، جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں یہ مقصد نہیں کہ کسی پر سختی کی جائے مگر فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق یہ اسمبلی کوئی متفقہ حل تلاش نہ کر سکی تو یہ خود بخود ٹوٹ جائے گی۔ صرف نمائندہ اسمبلی یا منتخب نمائندگان کی کوئی جماعت ہی مکمل طور پر نمائندہ حیثیت حاصل کر سکتی ہے۔ کانگرس کی نمائندہ حیثیت پر اعتراض کیا جاتا ہے اور کیا جا سکتا ہے مگر نمائندہ اسمبلی کے منتخب ڈیلی گیٹوں کی واحد نمائندہ حیثیت پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مسلمان کیوں اس اسمبلی کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا انہیں خدشہ ہے کہ مسلمان ووٹر مسلم لیگ کے امیدواروں کو منتخب نہیں کرینگے کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مسلم ڈیلی گیٹوں نے جو مطالبہ کیا وہ ناقابلِ مزاحمت ہوگا۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ ہندو اور اپنے دیگر بھائیوں کے ساتھ مل کر ایک قوم نہیں ہیں تو کون ان کی مزاحمت کر سکے گا۔ مگر یہ امر یقینی ہے کہ ۵۰ ہزار مسلمانوں کے، جنہوں نے قائدِ اعظم کی تقریر کو سنا، ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کے دعویٰ پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔"

مسلم لیگ کی قرارداد کی مخالفت کے باوجود مذکورہ بالا اظہارِ خیال پاکستانی سکیم کا فیصلہ نمائندہ اسمبلی کے منتخب نمائندوں پر چھوڑنے کی تائید کر رہا ہے۔ اور گاندھی جی نے بڑے زور سے کہا ہے کہ مسلم لیگ مسلم رائے دہندوں سے کیوں خوف کھاتی ہے۔ گاندھی جی ایسی بات کہنے میں حق بجانب تھے کیونکہ کانگرس اس سے پہلے فیصلہ کر چکی تھی کہ نمائندہ اسمبلی جداگانہ

انتخاب سے قائم ہوگی۔

گاندھی جی نے ۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو "ہریجن" میں "ایک پیچیدہ صورتِ حالات" کے عنوان سے ایک مضمون کے دوران میں لکھا کہ :۔

"جب تک باقی ہندوستان خانہ جنگی میں کودنے کو تیار نہ ہو اسے مسلمانوں کی شرائط کو اگر وہ کوئی پیش کریں منظور کرنا ہوگا۔ میرے پاس ایسا کوئی پُرامن طریقہ نہیں جس سے کہ میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کرسکوں کہ وہ باقی ہندوستان کی اطاعت قبول کرلیں خواہ کتنی زبردست اکثریت باقی ہندوستان کی نمائندہ ہو۔ مسلمانوں کو خود اختیاری کا ویسا ہی حق حاصل ہوگا جیسا کہ باقی ہندوستان کو۔ اس وقت ہم ایک خاندان مشترکہ ہیں اس خاندان کا کوئی ممبر تقسیم کا مطالبہ کرسکتا ہے۔"

اس مضمون میں گاندھی جی نے چند امور کی طرف اشارہ کیا ہے :۔

(۱) یہ کہ ان کے پاس کوئی پُرامن طریقہ نہیں جس سے وہ مسلمانوں کے مطالبے کو ٹھکرائیں اور انہیں باقی ہندوستان کی اطاعت پر مجبور کرسکیں۔

(۲) اگر مسلمانوں کو مجبور کرنا ہو تو خانہ جنگی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ کیونکہ آٹھ کروڑ انسانوں کو اس کے بغیر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کریں کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔

(۴) ہندوستان ایک مشترکہ خاندان ہے اس خاندان کا ہر ممبر اس کی تقسیم کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

ان باتوں کے متعلق مختصر سی گزارشات یہ ہیں کہ

(۱) ۱۹۴۷ء میں تو توجہ حکومت کے خلاف پُرامن جدوجہد کی طرف تھی اس لئے لوگ

جیلوں میں جا رہے تھے۔ مگر کچھ عرصہ بعد جب رہائیاں ہونے لگیں تو صورت حال نے پلٹا کھایا۔ مسٹر کے۔ ایم منشی جو بمبئی کے ایک وزیر ہوا کرتے تھے۔ عدم تشدد کے قائل بن کر ہی جیل کو گئے مگر جب جیل سے واپس آئے تو تشدد کا پرچار کرنے کی گاندھی جی سے اجازت لے کر نہ صرف تشدد کا پرچار کرنے لگے بلکہ مسلم لیگ کی قرار داد اور پاکستان کے موہوم مفروضے کی مخالفت میں دو تین سو برس کی خانہ جنگی کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

(۲) اس پروپگنڈے نے مسلمانوں سے خود فیصلہ کرنے کے حق کو چھینا اور ہندو نظریے کو ان پر ٹھونسنے کا عہد کیا۔

(۳) گاندھی جی نے ہندوستان کو ایک مشترکہ خاندان ٹھہرایا۔ حالانکہ برطانوی حکومت کے ہوتے ہوئے بھی برطانوی اور ریاستی ہندوستان ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ اور سیاسی مرکز ایک نہیں ہے۔ جس ملک میں چھ سو سے زائد چھوٹی بڑی ریاستیں موجود ہوں۔ اس کو غیر منقسم نہیں کہا جا سکتا۔ بالخصوص اس وقت جب کہ ریاستوں کو برطانوی ہندوستان کے ساتھ ایک فیڈریشن یا وفاق میں ملانے کی سب کوششیں اکارت ہو چکی ہوں۔

مسٹر راجگوپال اچاریہ

گاندھی جی کی طرح مسٹر راجگوپال اچاریہ نے جو مدراس میں کانگرس حکومت کے وزیر اعظم تھے ۲۲ر اپریل ۱۹۴۰ء کو ایک تقریر کے دوران میں اور باتوں کے علاوہ فرمایا کہ "...... انگلستان میں ہر شخص پاکستانی سکیم کی مخالفت کر رہا ہے۔ مسٹر جناح اسے کس طرح کامیاب بنا سکتے ہیں..... نمائندہ اسمبلی کے ذریعہ اس کی کامیابی کا کچھ امکان ہو سکتا ہے۔"

مسٹر راجگوپال اچاریہ بھی پاکستانی سکیم کی مخالفت کے باوجود نمائندہ اسمبلی پر اس کے فیصلہ کو چھوڑنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ اور اس سکیم کی کامیابی کے راستے میں جو مشکلیں ہیں۔

مسٹر جناح کو اس سے آگاہ کر کے انہیں نمائندہ اسمبلی کی طرف بلاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں انگلستان کی بہ نسبت زیادہ کامیابی کی توقع ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

۲۳ر اپریل ۱۹۴۰ء کو ہی واردھا سے مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کانگرس کے صدر تھے ایک بیان کے دوران میں کہا کہ:۔

"مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ یہ خیال اتنا غیر حقیقی فریب آمیز اور ناقابلِ عمل ہے کہ اگر لیگ اس پر دوبارہ غور کرے۔ تو وہ اس کو عملی جامہ پہنانے پر زور نہیں دیگی لیکن جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں۔ کہ اسے بھی مجوزہ نمائندہ اسمبلی کے مسلم نمائندوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کا حق صرف ان نمائندوں کو ہی ہو سکتا ہے جنہیں مسلمانوں نے منتخب کیا ہو۔ لیگ کوئی بھی سکیم پیش کر سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ دعوی نہیں کر سکتی۔ کہ کل یا اکثر مسلمان اسے قبول کرتے ہیں۔ اس قسم کی اسمبلی کے مسلم ممبران کے متعلق مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ کہ وہ کبھی ہندوستان کو تقسیم کرنے کی حمایت نہ کریں گے"۔

مولانا آزاد کے اس بیان سے واضح ہے کہ پاکستانی سکیم کا فیصلہ نمائندہ اسمبلی پر چھوڑنے کی تجویز کانگرس کے ارباب حل و عقد کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۴۰ء سے لے کر ۲۲ر اپریل ۱۹۴۰ء تک اسی مطلب کے مضمون دہرائے گئے۔ اور وہ بھی گاندھی جی مولانا آزاد اور مسٹر راجگوپال اچاریہ جی کے قلم و زبان سے۔

کانگرس کی مجلس عاملہ

مگر یہاں ایک نکتہ قابلِ بیان ہے۔ وہ یہ کہ ۳۰ر مارچ اور ۲۲ر اپریل کے درمیان

کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس واردھا میں ۱۵۔ اور ۱۶؍اپریل ۱۹۴۰ء کو ہو چکا تھا۔ مگر اس اجلاس میں اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کر رہے تھے۔ بلکہ کانگرس کی مجلس عاملہ نے اس مسئلے پر کامل غور و خوض کے بعد مکمل خاموشی اختیار کی۔ اس کا سبب کیا تھا۔ یہ تو کوئی مجلس عاملہ کا رکن ہی بتا سکتا ہے۔

بہرحال نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح برطانوی حکومت کے بعض ارکان بعض اوقات بیانات کے ذریعے قوموں کی تسلی کرتے ہیں۔ مگر پارلیمنٹ اور وزارت کوئی ضابطہ کی پابندی نہیں لیتی۔ اسی طرح مجلس عاملہ نے کوئی ضابطہ کی پابندی نہ لی۔ مگر کانگرس کے ذمہ دار رکن مسلمانوں کو راہِ عمل بتاتے رہے۔ اور شروع سے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویزیں جامہ عمل پہنتی چلی گئیں۔

ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان

مولانا آزاد نے بھی اور گاندھی جی نے بھی ہندوستان کی تقسیم اور ہندو ہندوستان اور مُسلم ہندوستان کا ذکر کیا ہے مجھے اس مرحلہ پر یہ گزارش کرنا ہے۔ کہ جب مسلم لیگ نے آبادیوں کی تقسیم کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ تو پھر ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کا ذکر کہاں تک مناسب ہے۔ کسی ملک میں خالص ہندو یا کسی علاقے میں خالص مسلمان آبادی کو بسانا پیش نظر نہ تھا۔ پھر ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے۔

میری دانست میں تو مختصر سوال یہی رہ جاتا ہے کہ آیا سارا ہندوستان، ہندو ہندوستان بنے۔ یا اس کا ایک حصّہ ہندو ہندوستان بنے۔ میں اس مسئلے پر آزاد مسلم کانفرنس منعقدہ

دہلی کی قراردادوں کے سلسلے میں بحث کرتے وقت زیادہ وضاحت سے لکھوں گا۔

جنگ آزادی

اگر جنگِ آزادی کو تقویت دینا مقصود ہوتا۔ تو گاندھی جی، مولانا آزاد اور مسٹر راجگوپال آچاریہ کے بیانوں کے ساتھ کانگرس کی مجلس عاملہ کا باضابطہ فیصلہ بھی آجانا چاہیئے تھا کہ اگر مسلم نمایندے نمایندہ اسمبلی میں اتفاق یا اکثریت سے کسی پاکستانی سکیم کا مطالبہ کرینگے تو ان کی بات کو مان لیا جائے گا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو مسلم لیگ اور اس کے ساتھیوں کو شکایت کا موقعہ نہ رہتا۔ اور نمایندہ اسمبلی کے مطالبہ کی تائید کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط ہو جاتے۔

مگر آزادی کامل کا مطالبہ اور اس کے لئے جدوجہد مطلوب نہ تھی۔ اور یہ بات اب اظہر من الشمس ہو چکی ہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء سے لے کر دسمبر ۱۹۴۲ء تک کی تحریکیں، تقریریں اور تحریریں اس حقیقت کی شاہد بین ہیں۔ کانگرس نے اس دوران میں کامل آزادی کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کی۔ بلکہ جو مطالبہ بھی ہُوا وہ انتقال اقتدار کی خاطر ہُوا۔ تاکہ حکومت کانگرس کے ساتھ براہِ راست فیصلہ کرے۔ اور اس کے مطالبات کو تسلیم کرے۔

اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نہ کانگرس مسلم لیگ سے اور نہ مسلم لیگ کانگرس سے گفت گو کرنے کی روادار تھی۔ گو بعض اوقات بعض لیڈر ذاتی ذمہ داری پر کوئی نہ کوئی پیش کش کرتے رہے۔

بہر حال اخیر اپریل ۱۹۴۰ء میں دہلی میں ایک آزاد مسلم کانفرنس منعقد کرنے کی سکیم مارچ سے ہی تیار ہوئی۔ اور اس پر عملدرآمد ہونے لگا۔

(۲۴)

پھر آزاد مُسلم کانفرنس

۱۹۳۱ء میں لکھنؤ کی آزاد مُسلم کانفرنس کے بعد ۱۹۴۱ء میں پھر دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس کی بُنیاد رکھی گئی۔ یہ فیصلہ مارچ ۱۹۴۰ء میں ہُوا۔ مَیں ان دنوں جیل میں تھا۔ اس لئے مجھے ابتدائی مراحل کا ذاتی عِلم نہیں البتہ یہ معلوم ہُوا۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مختلف اسلامی جماعتوں کے اجتماع کی سکیم پیش کی ہے۔ اور اُنہوں نے خود بھی کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا ہے۔ کانفرنس کا اجلاس ہُوا۔ مگر مولانا تشریف نہ لائے۔ ان کی تشریف آوری قرینِ مصلحت نہ سمجھی گئی۔

اجلاس کے وقت میں چند ہفتوں کے لئے جیل سے باہر آچکا تھا اس لئے مجھے کانفرنس کی ابتدائی مجالس مشاورت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔ چونکہ مجھے تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے میں کھُلے اجلاس میں شامل ہوکر اظہارِ خیال کرنے سے قاصر رہا۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں کئی ایک باتیں غور طلب اور سبق آموز ہیں۔ لیکن مجھے اس

سلسلۂ مضامین میں اپنے موضوع سے دور جانا مناسب نہیں۔ پس میں انہیں امور کا ذکر کروں گا۔ جن سے اس بحث کا تعلق ہے۔

کانفرنس کی غرض

مجھے کانفرنس کے انعقاد سے پہلے یہ اطلاع ملی تھی۔ کہ مختلف مسلم سیاسی جماعتیں ملکر آیندہ کے لئے کوئی لائحۂ عمل اور مشترکہ پروگرام سوچیں گی۔ اور آیندہ تعاون کی بنیاد ڈالیں گی۔ مگر کانفرنس کے بعد جب میں جیل میں تھا، تو مجھے باوثوق اطلاع ملی کہ ابتدا سے مقصد یہی تھا کہ چند قرار دادیں کانفرنس سے منظور کرالی جائیں اور بس۔ آیندہ تعاون ارباب حل وعقد کو منظور ہی نہ تھا۔

ابتدائی بحث وتمحیص

ابتدائی بحث وتمحیص میں میں نے حصہ لیا۔ میں نے ہندوستان کے جغرافیائی اور تاریخی حیثیت سے ایک ملک ہونے کے مطلوبہ اعلان کے خلاف اظہار خیال کیا۔ پاکستان کی مخالفت کی قرارداد کے سلسلے میں بھی کہا کہ ابھی مسلم لیگ سے اس سکیم کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ جب تک مسلم لیگ اپنی مکمل سکیم پیش نہ کرے۔ اور اس کے وزرائے اعظم اور اسمبلیوں کی مسلم لیگ پارٹیاں مکمل یا مجوزہ سکیم کی واضح تائید نہ کریں۔ اس وقت تک پاکستان کی مخالفت کا بیڑا اٹھانا مناسب نہیں۔ میں نے سوال کئے جانے پر یہاں تک بھی کہا۔ کہ اگر پاکستان کی سکیم حل ہی نکلے۔ تو اس میں مسلم اکثریت کے صوبوں کا کوئی خاص نقصان نہیں۔ میں نے مسلم مطالبات مرتب کرنے کے لئے بورڈ بنانے کی بھی مخالفت کی۔ اور کہا کہ مسلمان کئی مرتبہ مطالبات مرتب کرکے پیش کر چکے۔ اور کئی تجاویز کی تائید کرکے خمیازہ بھگت چکے۔ اب انہیں پھر من جرب المجرب" کا اعادہ نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ہندوؤں کی طرف سے تجاویز

مصالحت کا انتظار کرنا چاہیئے۔

مصالحتی تجویز

دو دن کی گفتگوؤں کے بعد ایک مصالحتی تجویز ایک غیر رسمی اجلاس میں مرتب کی گئی۔ اور مجلس انتخاب مضامین میں اس قرارداد کو پیش کیا جانا تھا۔ مگر جب ہم مجلس انتخاب مضامین کے اجلاس میں اس کے شروع ہونے کے دو چار منٹ بعد پہنچے تو دیکھا کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اپنی اصلی قرارداد کو پڑھ کر سنا رہے ہیں جس پر بحث ہونے کے بعد مصالحتی تجویز منظور کی گئی تھی۔

ہم نے دریافت کیا کہ مصالحتی قرارداد کیوں پیش نہیں کی گئی۔ جواب ملا کہ وہ راستے میں کہیں گر گئی ہے۔ مجھے افسوس ہوا کہ وہی قرارداد راستے میں گری جو مصالحت کی بنا پر تھی۔ کوئی اور قرارداد اس حشر کو نہ پہنچی۔ میں نے سمجھا کہ اب جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کا تماشہ دیکھنا پیش نظر ہے۔ اس لئے میں نے مزید کارروائی میں حصّہ لینا پسند نہ کیا۔ بلکہ علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مختلف احباب نے زور دیا کہ جلدی نہ کرو۔ ورنہ یہ کانفرنس ابھی ختم ہو جائے گی۔ بعض لوگ ایک عمدہ صورتِ حال پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہیں موقعہ دو کہ وہ اپنی کارروائی کر سکیں۔ کیونکہ مجوزہ بورڈ حقوق اسلامی کا تعین کریگا۔ اور وہ ایسا فیصلہ لائے گا جو مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔ جب بورڈ کی سفارشات آئیں گی۔ تو سب جماعتیں اس کانفرنس کی کارروائی کو اپنے اپنے اجلاسوں میں پیش کر کے اس کی تصدیق یا تردید کر سکتی ہیں۔ اس لئے ابھی سے اس کھیل کو بگاڑنا نہ چاہیئے۔

میرا انتظار

مجھے مجوزہ بورڈ کی مرتبہ تجاویز کا انتظار تھا۔ جب بورڈ کی ایک ماہ کے اندر اپنی

سفارشات پیش کرنے کی قرارداد سامنے آئی۔ تو میں نے کہہ دیا کہ ایک ماہ میں کچھ نہ ہوگا دو ماہ میعاد کی تجویز ہوئی۔ مَیں نے اس کو بھی ناکافی بتایا۔ بالآخر چار ماہ میں بورڈ کو اپنی سفارشات پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ جو بعد میں پھر دو ماہ میں بدل دیا گیا۔

مَیں ان سفارشات کا انتظار اس لئے کرنے لگا کہ اگر نیک نیتی سے کچھ بزرگ کوئی بات لانا چاہتے ہیں۔ اور ہندوستان کا مسئلہ پیچیدہ اسی طرح حل ہو جائے۔ تو چھوٹی موٹی باتوں کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ ان حالات میں مَیں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہیں وہ کریں۔ مجھے دخل نہ دینا چاہئے۔

میرا بورڈ کا ممبر نہ بننا

یہاں میں یہ بات بھی عرض کر دوں۔ کہ دہلی سے یہ خبر بھی نکل چکی ہے۔ کہ چونکہ مجھے اس بورڈ کا رکن بنایا نہ گیا تھا۔ اس لئے مَیں ناراض ہوا۔ اور مَیں نے جیل سے آکر دہلی میں اپنی تقریر کی جس میں آزاد مسلم کانفرنس کی کارروائی کے بورڈ والے حصے پر اظہار خیال کیا۔ لیکن اگر ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ طعنہ بازی شروع کی جائے تو کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس بورڈ کا رکن بننا جس نے چار ماہ مہینے میں رپورٹ پیش کرنی تھی۔ مگر جس نے چار مہینے کے اندر اپنا ابتدائی اجلاس بھی نہ کیا۔ اور ایک سال گزرنے کے بعد بھی جس کی کوئی کارروائی نہ ہوئی، کوئی ایسا قابلِ فخر عہدہ نہ تھا جس کے نہ ملنے پر سوا سال کے بعد رنجش کا اظہار ہوتا۔ اگر مجھے بورڈ کا رکن بننا ہوتا۔ تو کوئی مجھ کو روک نہ سکتا تھا اور مجھے رُکن بننے کے لئے کہا بھی گیا۔ لیکن چونکہ میرا اپیل ہائیکورٹ میں دائر تھا۔ مَیں ضمانت پر باہر آیا تھا۔ اور یہ اندیشہ بھی تھا۔ جو درست ثابت ہوا۔ شاید مجھے پھر جیل جانا پڑے۔ اس لئے میں نے احباب کے کہنے کے باوجود بورڈ کا رُکن بننے سے انکار

کیا۔ علاوہ ازیں میں تو پہلے ہی اس تجویز سازی کے خلاف تھا۔ اس لئے اس میں زیادہ ملوث ہونا پسند نہ کرتا تھا۔

اور باتیں

اس کانفرنس کے متعلق اب میں اور باتوں کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ ان باتوں کو بھی نظرانداز کروں گا۔ جو مجھے بعض احباب نے بطور امانت کے کہیں۔

کانفرنس کی قراردادیں

اب میں اس کانفرنس کی کچھ قراردادوں پر بحث کروں گا۔

متحدہ ہندوستان

ایک قرارداد متحدہ ہندوستان کے متعلق تھی۔ جس میں متحدہ ہندوستان کے سوال کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی جنگ اور اس میں مسلمانوں کے حصّہ پر زور دیا گیا تھا۔ مجھے ہندوستان کی جنگ آزادی سے اختلاف نہیں۔ مجھے اس میں مسلمانوں کو سنگِ راہ بنتے دیکھنا بھی پسند نہیں۔ میں نے اور میرے رفیقوں اور ہم خیالوں نے ہمیشہ جنگ آزادی میں حصّہ لیا ہے۔ میں قبل ازیں یہ بھی بیان کر چکا ہوں۔ کہ اقلیّت کے علاقوں سے مسلمانوں کی آبادیوں کو نکال کر لانا اور اسی طرح غیر مسلم اقلیتوں کو دوسرے علاقوں میں تبدیل کرنا ایک ایسا نامناسب اور دشوار کام ہے کہ اس کا موجودہ حالات میں تصوّر کرنا بھی درست نہیں۔ مجھے اس قرارداد کے حسب ذیل اعلان سے اختلاف ہے:۔

"ہندوستان اپنے جغرافیائی اور سیاسی حدود کے ساتھ ایک متحدہ ملک ہے۔"

یہ امر تو محتاج بیان نہیں۔ کہ مَیں نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء سے ہندوستان کو ایک متحدہ ملک بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یہ طریق کار پسند نہیں۔ کہ حقیقت کے

چہرے کو خواہ مخواہ بگاڑ کر پیش کیا جائے۔ میں نے اس اعلان پر بحث کرتے ہوئے آزاد مسلم کانفرنس کے موقعہ پر بھی مجالس مشاورت میں کہا تھا۔ اور اب بھی کہتا ہوں کہ ہمارے سامنے کوئی الہامی جغرافیہ اور کوئی مخصوص سیاست نہیں ہے جس نے ہندوستان کو ہمارے لئے ایک متحدہ ملک قرار دے رکھا ہو جس کی بنا پر ہم کوئی مختلف خیال رکھنے سے کافر اور جہنمی گردانے جائیں۔

موجودہ ہندوستان انگریزی حکومت کے آنے سے پہلے کبھی سیاسی لحاظ سے ایک ملک نہیں رہا۔ نہ اسے جغرافیہ نے ایک ملک بنایا ہے۔ بلوچستان اور ٹراونکور میں کونسا جغرافیائی اور سیاسی رشتہ ہے جو گزشتہ دس ہزار سال کے اندر نظر آتا ہے۔ صوبہ سرحد اور آسام میں کونسا جغرافیائی اور سیاسی تعلق رہا ہے۔ جب رامائن اور مہابھارت کی لڑائیاں لڑی گئیں۔ کیا اس وقت ہزاروں راجے اپنے اپنے علاقوں میں علیحدہ سیاسی مرکز بنا کر نہ بیٹھے تھے۔ کیا اب بھی کشمیر۔ حیدر آباد۔ میسور۔ پٹیالہ اور سینکڑوں دوسری ریاستوں میں علیحدہ سیاسی مرکز قائم نہیں۔

ابھی چھ برس ہوئے برما ہندوستان کا ایک جزو تھا۔ کیا وہ پہلے کبھی سیاسی طور پر ہندوستان کا جزو تھا؟ انگریزی حکومت نے اسے فتح کر کے ہندوستان میں شامل کیا۔ اسی طرح انہوں نے عدن کو بھی ہندوستان کا جزو بنا دیا تھا۔ حالانکہ وہ عرب کا ایک گوشہ تھا۔ بلکہ آج تو ایران اور عراق میں برطانوی اثر ہندوستان کے کمانڈر انچیف کے ماتحت ہے۔ تو کیا ایران اور عراق بھی ہندوستان کا جزو بن گئے۔ متحدہ ہندوستان کے حامی تو شاید اپنے مفاد کی خاطر ان کو بھی اپنے دائرہ عمل میں لینا چاہیں۔ اور پاکستان کے حامی انہیں پاکستان کا جزو دیکھنا مناسب سمجھیں۔

یوروپ کے حدود

یورپ کا ملک مشرق میں یورآل کے پہاڑوں سے چل کر مغرب میں بحراوقیانوس کے کناروں تک پہنچتا ہے۔ آج کل ہٹلر اپنی تلوار اور سیاست کے زور سے اس میں ایک نیا نظام قائم کرنے کے درپے ہے۔ وہ برطانیہ کی جنگی اور سیاسی طاقت کو ختم کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ لیکن کیا یورآل کے ایک طرف اور سمندر کے باقی اطراف میں ہونے کے باعث یورپ ایک متحدہ کہلا سکتا ہے۔ اور ہمیشہ جغرافیائی اور سیاسی حیثیت سے ایک ملک کہلائے گا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یورپ میں سینکڑوں بادشاہتیں بھی رہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ کبھی ایک نظام بھی ہو جائے۔ ہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے اور یورپی نقطہ نگاہ سے درست بھی کہلا سکتا ہے کہ "یورپ اپنی سیاسی حدود کے ساتھ ایک متحدہ ملک بن جائے۔ تو یورپینوں کے لئے مفید ہے" لیکن یہ کہنا کہ یوروپ اپنی جغرافیائی اور سیاسی حدود کے ساتھ ایک متحدہ ملک ہے، جغرافیہ اور تاریخ کا مضحکہ اُڑانا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ "ہندوستان کوہ ہمالہ کے ایک طرف اور سمندر کے باقی اطراف میں ہونے کے سبب سے جغرافیائی اور سیاسی حدود کے ساتھ ایک متحدہ ملک ہے" یقیناً جغرافیہ اور تاریخ کے ساتھ ظلم کرنا ہے اس لئے "ہندوستان ہمیشہ ایک رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک رہے گا" ایک غلط مقولہ ہے۔ خواہ اس پر اصرار کرنے والا کوئی جیکار ہو یا منشی ہو۔ نعیم ہو یا کفایت اللہ۔

ان حالات میں میں ان ہندوؤں اور مسلمانوں سے جو متحدہ ہندوستان کی فتنہ انگیز رٹ لگا رہے ہیں یہ کہوں گا کہ وہ تاریخ اور جغرافیہ کے واضح اور صریح حقائق کو جھٹلا کر ہندوستان کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔ بلکہ مخالف شکوک و شبہات کو زیادہ تقویت

دے رہے ہیں۔ جو لوگ تاریخ ہند کے ہزاروں سال کے حقائق کو غلط پیرایہ میں پیش کرنے پر بضد ہوں۔ ان سے مستقبل میں نیکی کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔

مقصود بالذات کیا ہے

یورپ ہزارہا بادشاہتوں میں تقسیم ہو تو پھر بھی امن قائم رہ سکتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوا ہے۔ اگر اسے ایک نظام کے ماتحت لایا جائے۔ تو بھی اس میں امن قائم رہ سکتا ہے۔ ہزار بادشاہتوں کے ہوتے ہوئے بھی امن میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اور ایک متحدہ یورپ بنانے کے بعد بھی نقصِ امن کا اندیشہ ہمیشہ کے لئے ٹل نہیں جاتا پس مقصود بالذات یورپ میں ہزارہا بادشاہتیں پیدا کرنا نہیں۔ اور نہ ایک متحدہ یورپ کی بادشاہت قائم کرنا۔ اسی طرح مقصود بالذات یہ نہیں کہ ہندوستان کو ضرور دس بیس یا ہزار حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ بلکہ یہ کہ ہمالہ کے پہاڑوں سے لے کر بحرِ ہند کے ساحلوں تک امن خوشحالی اور ترقی کا دور قائم کیا جائے۔

مسٹر منشی کا متحدہ ہندوستان

اگر مسٹر منشی اور مولانا نعیم کا متحدہ ہندوستان قائم ہوتا ہے جس کے لئے دو تین سو برس کی خانہ جنگی کے لئے ابھی سے تیاری ہو رہی ہے۔ اور لاہور میں اس مقصد مہمہ کا اعلان بر سرِ عام کیا گیا ہے۔ تو یقیناً کوئی متحدہ ہندوستان قائم نہ ہوگا۔ آج کا ہندوستان بھی متحدہ ہندوستان ہے۔ مگر اس کی بنیاد برطانوی سنگین کی نوک تیز پر ہے۔ پھر گاندھی جی۔ مولانا آزاد۔ مسٹر منشی۔ مسٹر جیکار۔ مولانا نعیم۔ مفتی کفایت اللہ اور دیگر بزرگ اس متحدہ ہندوستان سے مطمئن کیوں نہیں ہو جاتے؟ آج کل کوئی پاکستان تو ہے نہیں۔ پھر جنگ آزادی کیوں ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ مرکز کا ایک ہونا بھی امن قائم نہیں کر سکتا۔ برطانیہ کا تفوق ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کے طریقے باعثِ اطمینان نہیں۔

ہندوستانی فیڈریشن

ہندوستان کی ریاستیں آج بھی اپنی جداگانہ ہستیاں قائم رکھنے پر آمادہ ہیں۔ فیڈریشن کے مسئلے میں ان کی طرف سے انتقال اختیارات کے معاملہ پر بہت ردوکد ہوئی۔ اور ان کی کافی تعداد وفاق ہند میں شامل ہونے پر آمادہ نہ ہو سکی۔ اس لئے آج بھی ہندوستان کو محض ایک متحدہ سیاسی اکائی سمجھ لینا درست نہیں۔

دوسری قرارداد

کانفرنس کی ایک اور قرارداد ان الفاظ میں تھی "یہ مؤتمر کسی ایسی تجویز کو جو ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کردے۔ ناقابلِ عمل اور وطنی مفاد کے لئے خصوصًا مضر سمجھتی ہے۔ اور اسے یقین ہے کہ اس تجویز کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے راستے میں مشکلات پیدا ہوں۔ اور برطانوی شہنشاہیت اس سے فائدہ اُٹھائے۔"

اس مرحلہ پر مجھے یہ سوال کرنا ہے کہ ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان سے کیا مراد ہے؟ جب آبادیوں کے انتقال کا معاملہ مسلم لیگ نے ختم کر دیا۔ اور سارے ہندوستان میں اقلیتیں اور اکثریتیں بالعموم اپنی اپنی جگہ پر رہیں۔ تو پھر کوئی علاقہ خالص اسلامی یا خالص ہندو نہیں رہ جاتا۔ پھر ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے کیا معنی ہیں؟

مُسلم ہندوستان

اگر مُسلم ہندوستان کے یہ معنی لئے جائیں۔ کہ کوئی ایسا علاقہ ہو جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ اور وہاں مخلوط انتخاب بھی ہو۔ وہاں حق رائے دہی بالغان بھی ہو۔ وہاں اقلیتوں

کے حقوق کے تحفظات بھی ہوں۔ لیکن وہاں ممکن ہو۔ جیسا کہ نہرو رپورٹ کے فارمولوں میں ممکن تھا کہ مسلمان اسمبلیوں میں اکثریت میں آجائیں اور یہاں کی اسمبلی کو پورے یا قریبًا پورے اختیارات حاصل ہوں تو ایسے علاقہ کو مُسلم ہندوستان کہا جائے۔ اور ایسا مُسلم ہندوستان ناقابلِ برداشت ہو تو کئی اور سوالات پیدا ہونگے۔

ہندو ہندوستان

پہلا سوال یہ ہوگا۔ کہ ہندو ہندوستان کیا معنی رکھتا ہے۔ اوپر کے مُسلم ہندوستان کے تذکرے میں مُسلم کی بجائے ہندو کا لفظ رکھ دو۔ تو ہندو ہندوستان بن جائے گا۔ کیا ایسا ہندو ہندوستان قابلِ قبول نہ ہوگا۔

کل یا جزو

کیا اگر ہندوستان کے کسی محدود علاقے میں ہندو ہندوستان قائم کیا جائے۔ تو وہی ناقابلِ قبول ہوگا۔ یا اگر سارے ہندوستان کو ہندو ہندوستان بنا دیا جائے۔ تو وہ بھی ناقابلِ قبول ہوگا؟ فی الحقیقت یہ دوسرا سوال ہی اصلی مسئلے کی جان ہے۔ ہندو کا نظریہ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی محدود حصّے کو ہندو ہندوستان نہ بناؤ بلکہ سارے ہندوستان کو ہی ہندو ہندوستان بناؤ۔ اس لئے وہ متحدہ قومیّت، متحدہ ہندوستان، اکھنڈ ہندوستان جمہوریت، اور ایک شخص ایک ووٹ، وغیرہ کے آوازوں سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے مگر آزاد خیال مسلمان ہندوستان کے کسی محدود حصّے کو تو ہندو ہندوستان نہیں بننے دینا چاہتا۔ البتہ وہ سارے ہندوستان کو جس میں وہ ہمالہ سے لے کر راس کماری تک سارے ملک کو شامل کرتا ہے ہندو ہندوستان بنانے کے لئے زور لگا رہا ہے۔

میرے رفیق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے مسلم ہندوستان اور ہندو

ہندوستان کی اس قرارداد کو پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"آزادی کے معنے سمجھ لو۔ آزادی کے معنی یہ نہیں کہ ہندوستان میں کسی ایک فرقہ کا راج ہو۔ آپ خوب سمجھ لیجے کہ یہاں ہندو راج ہو سکتا ہے اور نہ مسلمان راج، اور نہ سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی راج ہو سکتا ہے۔ بلکہ آزادی کے معنی یہ ہیں کہ یہاں جو حکومت ہو وہ جمہوری نظام کے ماتحت ہو۔ جس میں ہم سب عوام برابر کے شریک رہیں....."

مگر اس سب تشریح کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب آزاد مسلم کانفرنس میں، مسٹر ساورکار ہندو مہاسبھا کے ہر اجلاس میں اور مسٹر ستیہ مورتی اپنے ہر بیان میں جو ہندوستان بنانا چاہتے ہیں۔ وہ مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان میں تقسیم شدہ تو نہ ہوگا مگر وہ کل ہندو کو ہندو ہندوستان ضرور بنا دیگا۔

اس لئے پاکستانی سکیم کی ہر صورت کی اندھا دھند مخالفت کرنے والوں کو طوفان میل کی طرح کسی جنکشن پر سستا کر سوچ لینا چاہئے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں۔

ہندو ہندوستان کی سکیمیں

آج تک ہندوستان میں مفاہمت کی جو سکیمیں بھی پیش ہوئی ہیں وہ سب کی سب ایسی تھیں جن سے سارے ہندوستان میں ہندو ہندوستان قائم ہوتا تھا۔ لیکن کانگرسی اور مہاسبھائی ہندوؤں نے ان کو اس لئے ٹھکرایا کہ سارے ہندوستان میں ان کی قوت ذرا کم بھی نہ ہو جائے۔ اور پنجاب و بنگال جیسے علاقوں میں ان کا تسلط ٹوٹ نہ سکے گو وہاں صوبوں کو محدود اختیارات ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔

مسٹر جناح نے جب تجاویز دہلی ۱۹۲۷ء میں پیش کیں اور ہندوؤں کے کہنے پر تو ان سے سارے ہندوستان میں ہندو ہندوستان قائم ہوتا تھا۔ مگر پنجاب اور بنگال

کے صوبجاتی اختیارات میں مسلمانوں کی اکثریت شریک ہو سکتی تھی۔ لیکن ہندوؤں نے اس سکیم کو ٹھکرا دیا۔

نہرو رپورٹ میں جو آئین پیش کیا گیا۔ وہ سارے ہندوستان میں ہندو ہندوستان کی کیفیت بناتا تھا۔ مگر خود ہندوؤں اور سکھوں نے ہی اس کی دھجیاں اُڑا دیں۔ تاکہ پنجاب کے صوبجاتی دائرے میں مفروضہ "مسلم راج" یا "مسلم ہندوستان" قائم نہ ہو جائے۔

آزاد مسلمانوں کا خدشہ

آزاد خیال مسلمانوں کو مُسلم اقلیّت کے صوبوں میں خطرہ ہے۔ کہ اگر شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان کے اسلامی اکثریت کے علاقے اپنی حکومتوں کے ماتحت ہو گئے۔ تو ہمارا کیا بنے گا؟ اگر یو۔ پی کے مسلمان مخلوط یا جُداگانہ انتخاب سے بیس فی صدی نشستیں حاصل کر کے یہ سوچتے ہیں کہ ہمارا کیا بنے گا۔ تو انہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اگر سارے کا سارا ہندوستان ایسا ہو۔ جس میں مسلمانوں کو پچیس یا تیس یا ۱/۳ ۳۳ فی صدی نشستیں مرکزی اسمبلیوں میں مل جائیں تو سارے ہندوستان میں سب مسلمانوں کا کیا بنے گا؟

اصل صورت حال کیا ہے

لالہ نانک چند صاحب ناز نے جو "آج کل" پر بھارت" کے مالک و مدیر ہیں اور قبل ازیں "ملاپ" اور "ویر بھارت" کی ادارت کے فرائض سرانجام دے چکے ہیں۔ اس لئے وہ ہندو نظریہ سے بخوبی واقف سمجھے جا سکتے ہیں آپ نے ملک برکت علی صاحب کے لائل پور والے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے "ویر بھارت" میں لکھا تھا کہ:-

"...... دنیا کی کسی بھی طاقت کو پنجاب سرحد اور سندھ کے ہندوؤں کو کسی ایسی حکومت کے ماتحت رکھنے کی مجال نہیں۔ جو مرکز سے وابستہ نہ ہو۔ اندرونی طور پر

ہندوستان کے سارے صوبے آزاد ہیں۔ مرکز ان کے معاملات میں دخل نہ دیگا۔ لیکن بیرونی حفاظت کی ذمہ واری مرکز کے ہاتھ ہی میں رہے گی۔ نہ رہے تو پنجاب کی مُسلم اکثریت ہندوؤں اور سکھوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی تباہ کرکے رکھدے.....“

(ویر بھارت ۲۲ جولائی ۱۹۴۱ء)

متحدہ ہندوستان کی تہ میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اس عبارت سے ظاہر ہے۔ ہندو قوم پرست تو یہ باتیں کہہ کر قوم پرست رہ سکتا ہے۔ مگر کوئی مسلمان اس کے متوازی بات کہہ کر قوم پرست نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ وہ کٹّر فرقہ پرست کہلائے گا۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ ” اگر ہندوستان کے مرکز میں ہندو اکثریت کی حکومت ہو۔ اور ہندوستان ایک متحدہ ملک ہو۔ تو راس کماری سے لے کر جمرود تک ہندوؤں کی غالب اکثریت جس کو فوج پر پورا اختیار ہوگا۔ مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کو تباہ کرکے رکھ دیگی۔“ تو مجھے کیا کچھ القاب وخطاب مرحمت نہ ہونگے۔ قوم پرست ہندوؤں کو سمجھنا چاہئے۔ کہ اگر ان کو یہ خطرہ ہے کہ ” پنجاب کی مُسلم اکثریت ہندوؤں اور سکھوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کو تباہ کرکے رکھ دیگی۔“ تو مسلمانوں کا اس کے بالمقابل یہ خطرہ کیوں قابلِ تسلیم نہیں۔ کہ ” ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کو تباہ کرکے رکھ دیگی۔“ پہلی بات ہندو کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ اس لئے درست ہے۔ دوسری بات مسلمان کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ اس لئے غلط ہے۔

(۲۵)

آزاد مسلم کانفرنس کی کچھ اور قراردادیں

آزاد مسلم کانفرنس دہلی میں ایک قرارداد یہ بھی منظور کی گئی کہ :-

"اس مؤتمر کی یہ قطعی رائے ہے کہ ہندوستان کی آیندہ حکومت کا دستور اساسی وہی قابلِ قبول ہوگا جو ہندوستانیوں ہی کا بنایا ہوا ہو۔ دستور ساز جماعت کے ارکان کا انتخاب ایسے اصول پر ہوگا جس میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہو۔ دستور اساسی میں مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کا تحفظ اسی طریقے پر ہوگا جو اس جماعت کے مسلم نمایندے منظور کرینگے۔ دوسری جماعت کے نمایندوں یا کسی بیرونی طاقت کو اس میں رائے یا مداخلت کرنے کا حق نہ ہوگا"

جداگانہ انتخاب

یہ قرارداد اپنی جگہ ایک ایسی قرارداد ہے جو کانگرس کی نمایندہ اسمبلی کی تجویز کے متوازی ہے۔ مگر اس میں اور کانگرس کی تجویز میں قدرے فرق ہے۔ کانگرس نے تو کہہ دیا تھا، کہ

مسلمانوں کی نمایندہ اسمبلی میں نمایندگی جُداگانہ انتخاب سے ہوگی۔ مگر اس قرارداد میں "جُداگانہ انتخاب" کے الفاظ کو دانستہ حذف کر دیا گیا ہے تاکہ آزاد مسلم کانفرنس کے ارباب حل وعقد یہ ظاہر کر سکیں کہ وہ ہندو قوم پرستوں سے بڑھ کر قوم پرور ہیں۔ اور وہ جداگانہ انتخاب سے نمایندہ اسمبلی قائم کئے جانے کے حق میں نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس فروگزاشت کی تلافی کرنا پڑی اور بورڈ والی قرارداد میں مسلمانوں ہی کو نمایندہ اسمبلی کے مسلم رُکن چُننے کا اہل قرار دیا گیا۔

فیصلہ کیسے ہوگا

اس قرارداد میں یہ تو ضرور کہا گیا ہے کہ :-

"دستور اساسی میں مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کا تحفّظ اسی طریقے پر ہوگا۔ جو اس جماعت کے مُسلم نمایندے منظور کرینگے۔ دوسری جماعت کے نمایندوں یا کسی بیرونی طاقت کو اس میں رائے دینے یا مداخلت کرنے کا حق نہ ہوگا"

ان الفاظ پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ میں ایک مرتبہ پھر یاد دلا دوں کہ اس فیصلے سے پہلے گاندھی جی، مولانا آزاد اور مسٹر راجگوپال اچاریہ اپنے بیانات میں نمایندہ اسمبلی کے ذریعے پاکستانی سکیم منوائے جانے کا ذکر کر چکے تھے۔ مگر جب کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہؤا تو اس میں اس بارے میں معنی خیز خاموشی اختیار کی گئی۔ مجلس عاملہ نے وہ پابندی نہ لی جو گاندھی جی اور دوسرے رہنما انفرادی حیثیت سے لے رہے تھے۔

آزاد مسلم کانفرنس کی قرارداد نے یہ تو کہا کہ دستور اساسی میں مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کا تحفّظ اسی طریقے پر ہوگا جو اس جماعت کے مسلم نمایندے کرینگے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس دستور ساز جماعت کے مسلم ارکان اکثریت یا اتفاق رائے سے کسی "پاکستانی"

سکیم کی حمایت کرینگے تو آزاد مسلم کانفرنس کی قراردادوں کی حمایت کرنے والوں کا کیا رویہ ہوگا کیا وہ اس صورت میں پاکستانی سکیم کی حمایت کرینگے اور مسلمانوں کا متحدہ محاذ قائم ہونے دینگے یا پاکستانی سکیم کے خلاف مسٹر منشی اور ان کے اکھنڈ ہندوستانیوں کے اعلان کے مطابق خانہ جنگی میں مسٹر منشی کا ساتھ دینگے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب قرارداد میں مُسلم حقوق اور مفاد کا تحفظ محض مسلم نمائندوں کی رائے پر منحصر ہے تو پھر اکثریت کا فیصلہ ہی قابلِ تسلیم ہوگا۔ لیکن مجھے یہ نکتہ واضح کرنا اس لئے ضروری ہے کہ نمائندہ اسمبلی کی یہ قرارداد اُس قرارداد بلکہ ان قراردادوں کے بعد پیش ہوئی جس میں ہندوستان کو جغرافیائی اور سیاسی حدود سے "ایک ملک" قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ "یہ مؤتمر کسی ایسی تجویز کو جو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کردے ناقابلِ عمل اور وطنی مفاد کے لئے خصوصاً مضر سمجھتی ہے"

اس اظہار خیال کے بعد نمائندہ اسمبلی کا وہ فیصلہ جو ان قراردادوں کے مخالف ہو ہندوؤں اور سکھوں وغیرہ کو قابلِ قبول ہو یا نہ ہو سب سے پہلے یہ دریافت کرنا پڑتا ہے کہ وہ "آزاد" مسلمانوں کو قابلِ قبول ہوگا یا نہ ہوگا۔

خانہ جنگی

اگر نمائندہ اسمبلی کے آزاد خیال مسلمانوں نے مُسلم اکثریت کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرنا ہے تو پھر نمایندہ اسمبلی بلانے کا فائدہ کیا ہے اگر یہ فیصلہ تسلیم نہ ہو تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس خانہ جنگی سے پہلے جس کی بنیاد مسٹر منشی ۱۹۴۱ء میں جیل سے باہر آکر رکھ چکے ہیں خود مسلمانوں ہی میں خانہ جنگی ہوگی۔ اور اس خانہ جنگی کے وقت ہی مسٹر منشی اور مولانا نعیم کا اکھنڈ ہندوستانی لشکر مسلمانوں کی اکثریت کو شکست دینے کے لئے میدان میں نکلے گا۔

درست راہِ عمل

درست راہِ عمل تو یہ تھی کہ کانگرس بحیثیت جماعت کے مسلمانوں کو یقین دلاتی کہ نمایندہ اسمبلی میں جداگانہ انتخاب سے آئے ہوئے مسلم نمایندے جس طریق حکومت کو پسند کرینگے اُسی پر عمل ہوگا اور "آزاد" مسلمان عامتہ المسلمین کو یقین دلاتے کہ نمایندہ اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت جو مطالبہ کریگی ہم اس کے ساتھ ہونگے۔ اس کے مخالف نہیں ہونگے اور اگر خانہ جنگی ہوئی تو ہم مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ ان کے خلاف ہندوؤں سے اشتراکِ عمل نہیں کرینگے۔

غلط راہ

مگر فیصلہ اُلٹ کیا گیا۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے دلچسپ خاموشی اختیار کی۔ اور اس کے مُسلم ارکان آزاد مسلم کانفرنس کے ذریعے کارروائی میں مصروف عمل ہوئے اور اُنہوں نے مُسلم حقوق کا تعین "بورڈ" کے حوالے کرنے پر زور دے کر ایسی قراردادیں منظور کرائیں جن سے مسلمانوں میں باہمی مخالف محاذ پہلے سے بھی زیادہ سرگرم کار ہو گیا۔

نتیجہ

نتیجہ کیا ہے؟ ان ہندوؤں کے حوصلے بڑھے جو مسلمانوں میں اختلاف دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا پسند کرتے ہیں۔ ان انگریزوں کو جو ہندوؤں کی بات سُننا زیادہ قرین مصلحت سمجھتے ہیں مسلم لیگ کے خلاف لکھنے بولنے کو ایک موقعہ مل گیا مسلمانوں کا باہمی عناد بڑھا جس سے کسی پارٹی کو وقتی فائدہ پہنچے تو پہنچے، مسلمانوں کو بحیثیت جماعت کے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ البتہ مولانا آزاد کے صدر کانگرس ہونے اور کانگرس کی مجلس عاملہ میں کچھ اور مسلمانوں کے لئے جانے کا فائدہ نظر آیا۔ اس لئے اب یہ بات نہیں کہی جاتی کہ نمایندہ اسمبلی

میں مسلمانوں کا مطالبہ منظور ہوگا یا ہو سکتا ہے۔ بلکہ اب برادرانِ وطن کا صاف اور صریح چیلنج یہ ہے کہ دو تین سو برس کی خانہ جنگی قبول ہو سکتی ہے مگر کسی قسم کی کوئی پاکستانی سکیم منظور نہیں ہو سکتی۔ یا یوں کہو کہ ہندوستان کے کسی حصّے کو مسلم انڈیا اور باقی حصّے کو ہندو انڈیا نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ سارے ہندوستان کو ہندو ہندوستان بنایا جائے گا۔ اگر کوئی بزرگ یہ فرمائیں کہ بات ایسے نہیں تو انہیں اس دستور کا کچھ مختصر سا خاکہ پیش کرنا چاہیئے جس سے سارا ہندوستان ہندو ہندوستان نہ بنے۔

بورڈ کا تقرر

بورڈ والی قرارداد کے متعلق پہلے ہی ذکر آچکا ہے اس لئے اس پر کچھ کہنا اب غیر ضروری ہے

جنگ میں غیر جانبداری

اب میں فقط ایک اور قرارداد پر بحث کروں گا۔ اس کا براہِ راست تعلق فرقہ وارانہ فیصلے سے نہیں ہے تاہم کچھ امور قابلِ ذکر ہیں:۔

اس کانفرنس میں مسلمانوں کو جنگ میں غیر جانبدار رہنے کے لئے کہا گیا۔ میں تمام قرارداد نقل نہیں کرنا چاہتا تاکہ حکومت موجودہ وقت میں اسے نامناسب خیال نہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ میں فرقہ وارانہ فیصلے کی آڑ میں جنگ کے خلاف پراپیگنڈا کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ بعض احباب نے مجھ پر بہت لے دے کی ہے کہ میں نے آزاد مسلم کانفرنس کی کسی قرارداد کے خلاف لب کشائی کیوں کی۔ لیکن مجھے تو اصولاً اختلافات تھے۔ جن کا میں نے احباب کے اصرار پر کانفرنس کی کارروائی کے خلاف فوری احتجاج نہ کیا تاکہ دو یا چار ماہ کے اندر مقررہ بورڈ کی تجاویز کو دیکھ لیا جائے۔

جن لوگوں نے جنگ میں غیر جانبدار رہنے کی پابندی لی تھی ان کا رویہ کیا ہے۔ کانفرنس

کی قرارداد میں پہلے تو تمہیدی واقعات تھے اور آخر میں کہا گیا تھا کہ

"ان حالات میں یہ کانفرنس واضح رائے رکھتی ہے کہ اسلامیان ہند کو موجودہ جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہیئے اور سامراجی طاقتوں کو کسی قسم کی مدد دینے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور انہیں نہ فقط اپنے ملک کی بلکہ دوسرے غلام ملکوں کی بھی امداد کرنی چاہیئے......"

اس کانفرنس کے صدر خان بہادر الہ بخش صاحب تھے۔ اور ان کی صدارت پر زور دینے والے خود کانگرس کے مسلمان لیڈر تھے۔ بلکہ وہ بھی جو کانگرس کی مجلس عاملہ کے رُکن تھے۔ ان دنوں خان بہادر وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز نہ تھے۔ اس کانفرنس کے بعد سندھ کی سیاست نے پھر پلٹا کھایا اور خان بہادر الہ بخش صاحب کو دوبارہ وزیر اعظم بننے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے بار بار جنگ میں حکومت کو امداد دینے کے اعلانات کیئے اور جب مُسلم لیگ نے سر سکندر، سر سعد اللہ اور مسٹر فضل الحق کو مجلس دفاع سے مستعفی ہونے کے لئے کہا اور ان کے استعفے داخل کرائے۔ تو کانگرس کے ارباب بست کشاد نے بمعہ گاندھی جی اور مولانا آزاد کے خان بہادر الہ بخش کو مجلسِ دفاع میں کام کرنے کے لئے کہا۔ آج کل آسام میں یہی منظر دہرایا جا رہا ہے۔ مجھ ایسے ناچیز لوگوں پر اعتراض کرنے والوں کو ذرا ایسے حقائق پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے

(۲۶)

اس خطا پہ مجھے مارا کہ خطا وار نہ تھا

میری گستاخیاں

۱۹۴۱ء میں پاکستان کے بارے میں جو بحثیں ہوئیں ان کا مختصر تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ ۱۹۴۰ء کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۹۴۱ء کے معاملات بحث سے خارج نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اس لئے مجھے ۱۹۴۱ء کے متعلق زیادہ تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں۔ البتہ کیفیّت حال کو مختصراً عرض کر دینا مناسب ہے۔

حکومت کا رویّہ

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وزیر ہند مسٹر ایمرے اور دوسرے لوگوں نے اپنی وقتی حکمت عملی کے لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسا رویّہ اختیار کیا ہے کہ ایک بات ایک کو پسند آئے اور دوسری بات دوسرے کو۔ ایمری نے صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اگر میں ہندوستانی ہوتا تو میں ہندوستان کو متحد اور متفق دیکھنا پسند کرتا۔

اس قسم کے الفاظ نے ہندوؤں کا حوصلہ بڑھایا کہ حکومت انجام کار ان کا ساتھ دیگی اور پاکستان کی کسی سکیم کو سرے نہ چڑھنے دیگی۔ لیکن ساتھ ہی مسٹر امیرے وزیر ہند نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہندوستان کا معاملہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی فیصلے کے بغیر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور حکومت ان کے متحدہ فیصلے ہی کو آیندہ آئین کا اساس قرار دے سکتی ہے۔ اس قسم کے الفاظ کہہ کر حکومت برطانیہ کے ارباب بست وکشاد نے مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی کہ پاکستان ہو نہ ہو، ہندوستان کے آیندہ نظام سیاسی کا فیصلہ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

گویا حکومت نے ایک ہاتھ ہندوؤں سے ملایا اور ان کو پرے ہٹایا اور دوسرا مسلمانوں سے ملایا اور ان کو دوسری طرف ہٹایا۔ اور خود درمیان میں بیٹھ کر دونوں کا ناچ ملاحظہ فرمایا۔

مسلم لیگ

مسلم لیگ نے زمانہ جنگ کے دوران میں پاکستان کے فیصلے کو اٹھائے رکھنے کا اعلان کیا لیکن اس خطرے کے پیش نظر کہ ہندو پروپیگنڈا ایک طرفہ کامیابی حاصل نہ کرلے پاکستان کے حق میں پروپگنڈا جاری رکھا۔

کانگرس

کانگرس نے سول نافرمانی کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا اس لئے اس نے بحیثیت جماعت کوئی قدم اٹھانے کا موقع نہ پایا۔ البتہ گاندھی جی کی سرکردگی میں اس کی پوزیشن یہ ہو گئی کہ

"ابھی ہندو مسلم سمجھوتے کا وقت نہیں آیا"

یہ بات کہہ کر گاندھی جی نے وقت کا انتظار کرنا شروع کیا اور حکومت کی جنگی کارروائیوں

سے قطع تعلق کر کے اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ کانگرس کے مطالبات کو تسلیم کرے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء
میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک بار پھر وہی پوزیشن لی جو پونا کی قرارداد میں لی جا چکی تھی۔

ہندو مہا سبھا

ہندو مہا سبھا نے جنگی کارروائیوں میں حکومت کی امداد کا فیصلہ کیا مگر ساتھ ہی اس نے مسلم لیگ کے مطالبے کو شکست دینے کے لئے اپنی جد و جہد کو جاری رکھا۔

مجلس احرار اسلام

مجلس احرار اسلام نے تازہ حالات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا میں اور میرے کئی ایک رفیق آزاد مسلم کانفرنس دہلی کے فیصلوں اور طریقِ عمل سے متفق نہ تھے۔ چنانچہ میں نے ۱۱ر جولائی ۱۹۴۱ء کو سیالکوٹ میں احرار کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ اظہار خیال قارئین کے سامنے آ چکا ہے۔ اس لئے اس کو یہاں دہرانا مناسب نہیں۔ البتہ اس کے متعلق چند ایک باتیں کہنا ضروری ہے :۔

(۱) نکتہ چینیوں نے میرے جملے جملے کو غور سے سُنا اور پڑھا لیکن وہ کسی جملے کو غلط نہ بتا سکے۔ سیالکوٹ میں اور اس کے بعد دہلی میں گفت گو کا موقع ملا تو میرے اس سوال پر کہ میرا کون سا جملہ غلط ہے یہی کہا گیا کہ واقعاتی لحاظ سے کوئی بات غلط نہیں۔ اور جب کہا گیا کہ پھر میرا قصور کیا ہے؟ تو جواب ملا کہ مجموعی حیثیت سے اندیشہ سا ہوتا ہے۔

قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میرے ہر جملے کے درست ہونے کے باوجود میرے نکتہ چینوں کو اندیشہ ہو سکتا ہے تو میرا اندیشہ کس قدر قوی اور حق بجانب ہوگا۔ جب میرے اعتراضات کا کوئی جواب ہی نہ ہو۔ میں اپنے اعتراضات کو قبل ازیں بیان کر چکا ہوں اس لئے ان کے اعادہ سے احباب کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

(۲) میرے سیالکوٹ کے خطبہ صدارت پر عجیب عجیب تنقیدیں ہوئیں مسلم اخبارات نے تو عام طور پر یہ کہا کہ یہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لئے بے قرار ہیں اس لئے احرار کارکنوں کو خدشہ ہُوا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

پنجاب کے ہندو اخبارات نے شور مچایا کہ مظہر علی تو مسٹر جناح سے مل کر سر سکندر حیات خاں کی وزارت کو توڑنے کی فکر میں ہے اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے باوثوق ذرائع سے خبر دی کہ اگر مسٹر جناح نے سر سکندر کے خلاف کوئی کارروائی کی تو سر سکندر، احرار اور جمعیتہ العلما وغیرہ سے سمجھوتہ کر کے اپنی وزارت کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں گے۔

مگر مجلس احرار کے ۱۹۳۷ء کے اس فیصلے کے بعد کہ احرار کا کوئی ممبر مسلم لیگ کا ممبر نہیں ہو سکتا، میں یا میرے کوئی ساتھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کا وہم وگمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں ملکی اور بیرونِ ملکی سیاسیات کے بارے میں ہمارا اور عام مسلم لیگی رہنماؤں کا نظریہ اور طریقِ کار عموماً اس قدر مختلف چلا آیا ہے کہ ذہنی اور قلبی اعتبار سے ادغام کا امکان ہی بہت کم ہے۔

جہاں تک وزارت کا تعلق ہے ہم اپنی گزشتہ ڈھائی برس کی سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر کسی وزارت کو ترتیب دینے میں نہ شریک ہو سکتے ہیں اور نہ کئے جا سکتے ہیں اور موجودہ حالت میں جب پنجاب کی اسمبلی میں ہماری اپنی طاقت تقریباً بے اثر ہو اور کانگرس بھی اسمبلی کا بائیکاٹ کئے ہوئے ہو تو وزارت کو توڑنے کے خواب لینا ضرورت سے زیادہ ہوشیار لوگوں کا کام ہے۔ اس پر میرے جیسے قصیر الفہم لوگ کہاں دلچسپی لے سکتے ہیں۔

دہلی کی تقریر

دہلی میں ۲۳ راگست کی شام کو تقریر کرتے ہوئے میں نے اپنے سیالکوٹ کے خطبہ صدارت کے علاوہ بھی کئی ایک باتیں کہیں جو تفصیلات اور دلائل کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ تقریر بھی کئی رنگوں میں دنیا کے سامنے آچکی ہے۔ اکثر اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں نے اسے بگاڑ کر پیش کیا۔ اور ایک نے فقط یہی کہنا مناسب سمجھا کہ مظہر علی نے اپنی تقریر میں پاکستان کی حمایت کی۔

جب میں دہلی سے آگرہ پہنچا تو ایک دوست نے اس رپورٹ کا تذکرہ کیا اور کہا کہ میں نے تو دہلی میں آپ کی تقریر کو سنا ہے۔ آپ نے تو پاکستان کی حمایت نہ کی تھی۔ آپ کو اس رپورٹ کی فوراً تردید کرنی چاہئے۔ تو میں نے جواب دیا کہ اگر یہ رپورٹ محض اس لئے گھڑی گئی ہے کہ میں مطلوبہ تردید کروں۔ تو میں ایسی تردید کرنے سے انکاری ہوں۔ آپ نے تقریر کو سنا ہے آپ اپنی طرف سے جو تردید کرنا چاہیں سو کریں۔ انہوں نے تردید سے انکار کیا۔

اس واقعہ کے تذکرے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں بتاؤں کہ کس طرح میرے طویل اظہار خیال کو ایک غلط جملے میں سکیڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ کہ تمام معروضات، تمام دلائل اور تمام واقعات سے قطع نظر کر کے ایک لفظ منہ سے نکلوایا جائے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ میں اس قسم کی چالاکیوں سے بیزار ہوں۔ اور ایسے طرز عمل کو ناپسندیدہ اور ہندوستانی مفاد کے بالکل منافی سمجھتا ہوں۔ اس لئے اس سے بے نیاز ہو کر اپنے کام کو جاری رکھتا ہوں۔

(۲۷)

میرا نظریہ

اب جبکہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق میں مختصراً ذکر کرتے ہوئے بھی کافی مسائل پر تبصرہ کر چکا ہوں۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار بھی کر چکا ہوں مناسب ہے کہ میں آخر میں اپنے نظریہ کو پھر دہرا دوں تاکہ سمجھنے میں سہولت ہو۔

پاکستان یا متحدہ ہندوستان

میری نگاہ میں محض جغرافیائی حدود قیام امن واطمینان کے لئے کافی نہیں۔ جغرافیائی وطنیت نے دنیا میں بہت کچھ رنگ دکھایا ہے۔ مگر بنی نوع انسان کی حقیقی ترقی کی راہ یہ نہیں ہے کہ جغرافیائی حدود کو اندرونی استحکام اور بیرونی لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بنایا جائے زمانہ حال کی متمدن قوموں نے جغرافیائی وطنیت کے ذریعے بہت کچھ کمایا ہے۔ مگر جو کمایا تھا وہ آخر اسی کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ موجودہ جنگ اس صدی کی دوسری جنگ ہے۔ جس نے چالیس برس کے اندر اندر ایک عالم کو تباہی وبربادی کا شکار بنایا ہے۔

جغرافیائی وطنیت کی طرح مذہبی وطنیت بھی کوئی پائدار بنیاد نہیں رکھتی اگر مذہب کا

نظریہ بنی نوع انسان کی بہتری، بہبودی اور خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ اگر مذہب قوم کے ایک حصّے کو ذلّت اور افلاس کے سپرد کرے۔ اور دوسرے کو عزّت اور دولت کا مالک بنائے تو مذہبی وطنیت یا مذہبی قومیّت ایک وقت تک اپنا سکّہ چلا سکتی ہے۔ مگر غیر مساوی انسانیت کے نظام کو دائمًا عروج نہیں ہو سکتا۔ برہمن اور کھشتری ایک عرصہ تک شودر کو اپنا ذلّت نصیب غلام بنا سکتے ہیں۔ لیکن نظام کا اندرونی بوسیدہ پن ہی اس کے لئے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ اور اگر برہمن کی جگہ سیّد لے لے اور کھشتری کی جگہ مغل اور شودر، شودر ہی رہے خواہ وہ مندر کا پجاری بننا چاہے یا مسجد کا مصلّی۔ تو اسلام کے حلقہ بگوشوں کا حشر شو مہاراج کے داسوں سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

میری نگاہ میں انسانیت کی بُنیاد محنت اور ایثار پر ہے۔ اگر انسان محنت سے کمائے نہیں اور دوسروں کی بہتری میں دل کو لگائے نہیں تو وہ عقل و فہم اور مال و دولت کا مالک تو ہو اور کہلا سکتا ہے۔ مگر وہ انسانیّت کے حقیقی فرض کو ادا نہیں کرتا۔ ایک ملک۔ ایک مذہب۔ ایک نسل اور ایک زبان ہونے کے باوجود متمدن ممالک کی خانہ جنگیاں آج صاف صاف بتا رہی ہیں کہ جب تک تمام آبادی کی ضروریات کا کماحقہٗ خیال نہ رکھا جائے محض ایک ملک، ایک مذہب، ایک نسل یا ایک زبان کے نعرے مختلف افراد کو یکجہتی اور اتحاد کی دولت سے مالا مال نہیں کر سکتے۔ وہ کشمکش جو ۱۷ء اور ۱۸ء کے زمانے میں روس میں ہوئی اور بعد ازاں بھی ہوتی رہی۔ اور وہ کشمکش جو ۳۶-۳۵ء میں ہسپانیہ میں ہوئی۔ اور وہ کشمکش جس کا نظارہ یا خدشہ دنیا کے دوسرے ملکوں نے جن میں ہنگری اور چین جیسے ممالک شامل ہیں دیکھا ہے، صاف ظاہر کرتی ہے کہ محنت اور ایثار کے بغیر دنیا میں خوشحالی اور امن کا دور قائم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جغرافیائی قومیت یا مذہبی قومیت کا رنگ دنیا میں صدیوں تک غالب رہا ہے۔ مگر اب پرانی لکیر کے فقیر بن کر مستقبل کو سنبھالا نہیں جا سکتا۔ پرانے نظریوں کے حق میں بہت کچھ دلائل دئے جاتے رہے ہیں۔ اور آج بھی دئے جا رہے ہیں۔ مگر ان نظریوں میں گراں قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔

متحدہ ہندوستان کا نظریہ ایک عام فہم نظریہ تھا۔ اور برسوں تک اس میں کوئی نقص نظر نہ آیا۔ مگر جغرافیائی حدود تو کسی زلزلے سے تباہ نہیں ہوئے۔ جمرود سے لے کر سلہٹ تک اور گلگت سے لے کر ٹراونکور تک وہی پہاڑ ہیں، وہی دریا، وہی میدان، وہی ریگستان، وہی آبادیاں اور وہی انسان، مگر متحدہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔
ہندوؤں کے مذہب میں کوئی بڑی نئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ مسلمانوں کا مذہبی تخیل کچھ اور ہو گیا ہے۔ بلکہ انگریزوں سے جو کچھ حاصل کیا جا رہا یا کیا جانے والا ہے۔ اس کی تقسیم کے متعلق ہندو اور مسلمان سرمایہ داروں کا اختلاف ہے۔ جو نئے مسائل پیدا کر رہا ہے انگریزوں کے ماتحت ہندوؤں کو جو اقتدار حاصل ہے وہ اسے مضبوط کرنے کے درپے ہیں۔ مسلمانوں کو خدشہ ہے کہ وہ خسارے میں نہ رہیں۔ مفاد کی جنگ نے مذہب کو بھی بیچ میں لا پھینکا۔ کیونکہ جنگ اور عشق میں ہر حربہ چلایا جاتا ہے۔

قصّہ کوتاہ قیامِ امن اسی خطہ میں ہو سکتا ہے جس کے رہنے والے ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔ جو کسی مصیبت زدہ کا اس کی مصیبت میں ہاتھ بٹائیں۔ اس ذہنی کیفیت سے بے نیاز ہو کر نہ متحدہ ہندوستان کوئی حقیقت رکھتا ہے اور نہ پاکستان۔

باہمی اتحاد

پاکستان کے بعض حامیوں نے اپنے نظریہ کی بنا اس مفروضہ حقیقت پر رکھی۔ کہ

ہندو اور مسلمان نہ کبھی متحد ہوئے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کو علیحدہ علیحدہ وطنوں میں جگہ دی جانی چاہیئے لیکن مسلم لیگ اور مسٹر جناح نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اس نظریہ کے بالکل مخالف ہے۔ مسلم لیگ تو یہی چاہتی ہے۔ کہ آبادیوں کا کم سے کم تبادلہ کیا جائے اور ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے علاقوں میں رہیں۔ اس لئے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں یکجہتی اس صورت میں ہی پاکستان کی کوئی سکیم قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔ اگر نظریہ یہ ہو کہ مُسلم اور غیر مُسلم کبھی صلح سے نہیں رہ سکتے۔ اور ایک دوسرے کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ تو پاکستان کا کوئی نظریہ قابلِ قبول یا قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔

ان حالات میں ہر ہندوستانی کا فرض ہے خواہ وہ متحدہ ہندوستان کا حامی ہو خواہ پاکستان کا کہ وہ مختلف مذاہب کے لوگوں میں باہمی اتحاد اور یک جہتی کی تلقین کرے اور اس کے لئے بہترین فضا پیدا کرنے میں ہر وقت کوشاں رہے۔ جن لوگوں نے پاکستان یا متحدہ ہندوستان کے نام پر ایک مذہب کے لوگوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں کے خلاف اُکسانا شروع کر رکھا ہے۔ وہ سستی لیڈری تو عارضی طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ملک و ملت کی بہتری و بہبودی کی راہ سے کانٹوں کو ہٹا نہیں سکتے۔ بلکہ خود وہاں خارِ مغیلاں بن کر رہ جاتے ہیں۔

اقلیتوں کا نظام

متحدہ ہندوستان ہو یا پاکستان اس میں اقلیتوں کو اپنی سیاسی جماعت بنانے سے روکنا اور اگر وہ ایسی کوشش کریں تو ان کو ملزم گردانا ایک خود غرضانہ ناانصافی ہے۔

متحدہ ہندوستان کے کانگرسی رہنماؤں نے اکثر اس بات کو ناپسند کیا ہے۔ کہ مسلمانوں کی کوئی آزاد خیال جماعت اپنی علیحدہ ہستی برقرار رکھے۔ بلکہ وہ تو کسی سیاسی

مسلم جماعت کو اصولاً برداشت نہیں کرتے۔

لیکن اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ہندوستان کو پاکستانی سکیم کے مطابق مختلف حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تو کیا وہ پسند کرینگے۔ کہ پنجاب یا بنگال کے ہندوؤں یا سکھوں کو علیٰحدہ سیاسی جماعت بنانے کا حق نہ دیا جائے۔ اور یہی کیا جائے کہ وہ ملک کی متحدہ سیاسی جماعت کے رکن ہی بنیں۔ حالانکہ اس میں مسلمانوں کی ہمیشہ اکثریت ہوگی۔ کیا پنجاب کے ہندو یا سکھ اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ اور کیا بیرون پنجاب کے غیر مسلم رہنما ان کو اس بات کے تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ پھر جو چیز اپنے لئے پسند نہیں وہ دوسروں کے لئے پسند کیوں کی جاتی ہے۔

مجلس احرار اور مسلم لیگ

بعض اصحاب یہ دریافت فرماتے ہیں۔ کہ مسلم لیگ کی موجودگی میں مجلس احرار کی کیا ضرورت ہے۔ ان دوستوں کو سمجھ لینا چاہئے۔ کہ مصلحت کوشی میں گوشہ نشین رہ کر گاہے گاہے چند قرار دادوں کے ذریعے قوم کو سیاسی اور مذہبی زندگی کا درس دینے والے ادہر اُدہر سے چند عہدے تو حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خود بھی دولت مند بن سکتے ہیں۔ مگر قومی زندگی کی اصلاح کے لئے جس قربانی اور ایثار کی ضرورت ہے۔ وہ اس جماعت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ جس کی عنانِ اقتدار حکومت پرستانِ ازلی و ابدی کے ہاتھ میں ہو۔ جن کے قربانی وایثار سے کنارہ کشی ہی راہِ نجات ہو۔

مثال کے طور پر ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر مسلمانانِ کشمیر کی حالت کو سُدھارنے کے لئے ایک اہم کوشش تھی مگر مسلم لیگ نے کیا کیا؟ مجلس احرار کی قربانیوں نے اسلامیان ہند میں نئی روح پھونک دی۔ وہ روح آج بھی کارفرما ہے۔ اور ہر مخالفت کے باوجود کارفرما

رہے گی۔ جھوٹے پروپگنڈے کسی کارکن کو بدنام اور کمزور کر سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھیں کہ ہم نے ایک کارکن جماعت کو ناکام بنا کر کامیابی حاصل کی ہے۔ انہیں سمجھ لینا چاہئیے۔ کہ ان کی کامیابی قوم کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

احرار اور کانگریس

بعض احباب کو یہ فکر بھی ہے کہ ہمیں کیا ہو گیا۔ کہ ہم کانگرس سے اپنی وابستگی بڑھانے کی بجائے کم کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ ہمیں خود کو مضبوط بنا کر کانگرس میں مدغم ہو جانا چاہئیے۔ لیکن اس زمانے میں جب کہ ہندو اور مسلمان کا کام محض تخریبی ہو۔ اور حکومت وقت سے ٹکرا کر آزادی ملک کی جدوجہد کو تیز کرنا ہو۔ اس زمانے میں تو علیحدہ جماعت کا ہونا یا نہ ہونا کچھ ایسا ضروری نہیں۔ جب حقوق حاصل کر کے انہیں تقسیم کرنے اور نظامِ حکومت کو چلانے کا دَور آجائے۔ اور وزارتیں سنبھال کر یا ان کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر ان سے حسب منشا کام لینے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس وقت ایک علیحدہ جماعت کو جو بالکل آزاد ہو، قائم کیا جانا ازبس ضروری ہے۔ اس لئے موجودہ اور آیندہ زمانوں میں ایسی آزاد خیال جماعت کی جُداگانہ ہستی کو مضبوط بنانا ہر حریت پسند کا فرض ہے جو ملک کی آزادی کی خاطر غیر ملکی حکومت سے ٹکر لینے میں کسی غیر مسلم جماعت سے پیچھے نہ ہو۔ اور اسلامی حقوق کی نگہداشت میں جہاں حکومت سے ٹکرانے میں گریز نہ کرے۔ وہاں کسی غیر مسلم جماعت سے بھی دینے کے لئے تیار نہ ہو۔

موجودہ حالات میں جو رویّہ غیر مسلم اکثریت نے اختیار کیا ہُوا ہے۔ اس کے پیشِ نظر اشتراکِ عمل ہو سکتا ہے۔ مگر وحدتِ نظام اور وحدتِ عمل کی گنجائش نہیں۔ اور نہ کوئی سمجھ کر بات کرنے والا انسان کسی اقلیت کو مشورہ دے سکتا ہے۔ کہ وہ مستقلاً وحدتِ

نظام اور وحدتِ عمل کو اپنا شعار بنائے۔

اصلی ضرورت

فرقہ وارانہ فیصلہ کی اس وقت تک جو کوششیں ہوئی ہیں وہ دراصل ہندو سرمایہ داری اور مسلم سرمایہ داری میں وحدتِ عمل یا اشتراکِ عمل کی کوششیں رہی ہیں۔ اگر ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تو کچھ ایسے افسوس کی بات نہیں کیونکہ سرمایہ داروں کی صلح سے غریب کی شامت آجاتی ہے۔ غریب آج بھی مصیبت میں ہیں۔ اور جب تک ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ دنیا کو امن نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نوع انسانی کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ سوچے کہ اصلی ضرورت کیا ہے؟

(۲۸)

اصلی ضرورت کیا ہے

بنیادی حقوق

عام طور پر جب انسانوں کے بنیادی حقوق کا فیصلہ کرنے کی سکیم مرتب کی گئی، تو ہندوستان میں یہی کہا گیا کہ لوگوں کو آزادی تحریر و تقریر حاصل ہونی چاہئے۔ انہیں اپنے مذہبی رسم و رواج کو ادا کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ انہیں جمع ہونے اور مظاہرہ کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ جمہوری نظام میں اسی قسم کے حقوق کا بہت ڈھول پیٹا گیا ہے اور سب سے زیادہ زور انہیں پر دیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاملات بہت اہم ہیں اور ان حقوق کا حاصل ہونا افراد اور جماعتوں کے لئے مفید اور مناسب ہے لیکن ایسے بنیادی حقوق کے فیصلوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ انسانی ضرورتیں ان حقوق کے استعمال سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے سوال یہ نہیں رہتا کہ یہ حقوق انسانوں کو حاصل ہوں یا نہ ہوں،

بلکہ سوال یہ ہے کہ آیا انسان اس قابل بھی ہیں یا نہیں کہ وہ ان حقوق کا درست اور مناسب استعمال کر سکیں۔

آزادی تحریر و تقریر تو اس وقت ہو گی جب کوئی جماعت یا سوسائٹی ایسی ہو جس سے خطاب کرنا ہو۔ کوئی سُننے والا ہو۔ کوئی پڑھنے والا ہو۔ کوئی بولنے والا ہو۔ کوئی لکھنے والا ہو۔ مگر انسان بولنے والا اور لکھنے والا اس وقت ہو گا جب اس کو تربیت ایسی دی جائے کہ وہ بول اور لکھ سکے۔ تقریر اور تحریر کے قابل ہونے سے پہلے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندہ رہے۔ اس کی صحت درست ہو۔ اس کی تعلیم مناسب ہو۔ اس کی جسمانی اور ذہنی تربیت اس کو ایسا آراستہ کرے کہ غیر ضروری خامی رہ نہ جائے۔

خوراک

انسان ماں کے پیٹ سے بالکل بے بس اور جاہل پیدا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس کی نگہداشت نہ کی جائے تو بچّہ ضائع ہو جاتا ہے۔ بچّے کے ساتھ اس کی ماں کی خبر گیری بھی ضروری ہوتی ہے۔

لیکن سوسائٹی نے عام طور پر اس اصول کو قبول نہیں کیا کہ ہر انسان کو خوراک کی ضرورت ہے اور ہر سوسائٹی کا فرض ہے کہ وہ اپنے افراد کو بھوک کی مصیبت میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

یتیموں کی پرورش کو فرض اور ثواب سمجھنے والے بھی اکثر فراموش کر جاتے ہیں کہ یتیموں کے علاوہ ہر انسان خواہ بالغ ہو یا نابالغ خوراک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

پوشاک

خوراک کے ساتھ پوشاک کی بھی ضرورت ہے۔ ہر بچے، جوان اور بوڑھے کو موسم

اور ملک کے مطابق پوشاک چاہئے۔ کپڑوں کے بغیر لوگ مصیبت کی زندگی اور کرب کی موت سے دوچار ہوتے ہیں۔

مکان

خوراک اور پوشاک کے علاوہ رہائش کے لئے مکان کی ہر کسی کو ضرورت ہے تاکہ وہ گرمی اور سردی، بارش اور آندھی سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

ہر ذی شعور جانتا ہے کہ گھونسلے کے بغیر چڑیا اور سوراخ کے بغیر چیونٹی بھی بسر اوقات نہیں کر سکتی۔ لیکن کتنے انسان ہیں جو در و دیوار کو ترستے ہیں۔ اور آج کل کی متمدّن اور مہذب دُنیا میں سردیوں کی تاریک اور ٹھنڈی راتیں کپڑوں کے بغیر درختوں کے سائے میں بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن وہاں سے بھی اُن کو ہنکا دیا جاتا ہے۔ کیا تہذیب اور تمدّن اسی عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ کیا نوع انسانی کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے لئے بلند سے بلند اور وسیع سے وسیع محل اور آسائش کدے تیار کرے اور پھر دوسروں کو درختوں کے سائے اور دکانوں کے چبوتروں سے ہنکا کر فخر سے سر بلند کرے اور اپنے نرم گدیلوں پر عشرت کی رات بسر کرنے کو دوڑے۔

نظامِ حاکمہ کا فرض

ہر سوسائٹی کے نظامِ حاکمہ کا پہلا فرض اور لازمی فرض یہ تھا کہ وہ اپنے افرادِ ملک کو خوراک۔ پوشاک اور مکانیت کے قحط سے بچائے۔

یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ کچھ لوگ گھروں میں کپڑوں کے انبار لگائے بیٹھے ہوں اور کپڑوں کے پہننے کی باری نہ آئے اور کچھ لوگ عید شبرات بھی بدن ڈھانپنے کے لئے پیوند نہ لگا سکیں۔

یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ کچھ لوگ مکان پر مکان بناتے جائیں، اور بیشتر لوگ خانہ بدوشی میں عمر گنواتے جائیں۔

تعلیم و تربیت

پھر جن لوگوں کو خوراک۔ پوشاک اور مکان تک نہ ملے ان کی ذہنی تربیت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جو تمدّن سیاسی زیست کا بندوبست نہیں کرتا وہ ذہنی اور روحانی ترقی پر کیوں دھیان دیگا۔ وہ حفظانِ صحت کا کیسے خیال رکھے گا۔

میری دانست میں کوئی حکومت صوبت کہلانے کی حقدار نہیں اور کوئی سوسائٹی متمدّن کہلانے کی اہل نہیں۔ اگر وہ اس بُنیادی حقیقت کو فراموش کردے کہ اس نے ہر کرومہ کی خوراک۔ پوشاک۔ مکان۔ تعلیم و تربیت اور صحت کا پورا خیال رکھنا ہے۔ ایک وقت تھا جب ذرائع آمد و رفت ترقی یافتہ نہ تھے اور دُنیا بہت وسیع معلوم ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مقامی حالات کو اپنے پر چھوڑا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے سلکی اور لاسلکی کے زمانے میں اجتماعی نگہداشت کی ضرورت ہے۔

قومی نقصان

موجودہ زمانے میں دُنیا کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ اکثر غریب بچّے (اور دنیا میں غریبوں کی بہت بڑی اکثریت ہے) اچھی تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکتے۔ بہترین صحت کے مالک غریبوں کے بچّے ہو سکتے ہیں۔ انہیں محنت اور مشقّت کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ انہیں کُھلی ہوا میں رہنے کی مجبوری ہوتی ہے۔ غریبوں کی اولاد کے دل و دماغ وراثتی بیماریوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لئے جب ہم غریبوں کی اولاد کی تعلیم و تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ تو گویا ہم اپنے بیش بہا لعل گودڑیوں میں چھپا رکھتے ہیں اور

ان کی نور پاشی اور دلآویزی سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ غریبوں کے قابل فرزندان پھولوں کی طرح ہیں جو جنگلوں میں بن دیکھے مُرجھا جاتے ہیں۔

غریب گھر کا نپولین ابو رہن خاندان کے سب افراد سے زیادہ قابل ہوتا ہے۔ مگر غریبوں کے بہت سے نپولین زندگی کی دوڑ کے میدان میں آہی نہیں سکتے۔

غریب گھر کا اقبالؒ مشرق کا جلیل القدر شاعر بن سکتا ہے۔ مگر غریبوں کی اکثر اولاد جوہر علم سے آراستہ نہیں ہو سکتی۔

نقصان فقط غریبوں کا ہی نہیں ہوتا بلکہ قوموں کی تو ہیں بلکہ یوں کہو کہ سب عالمِ انسانیت اپنے بہترین افراد کی جلیل القدر خدمات سے محروم ہو جاتا ہے۔ خدا ہی جان سکتا ہے کہ انسانی نظام کی خود پسندیوں نے بنی نوعِ انسان کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے انسان اپنے ظلم کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

حکومت کا فرض

ان حالات میں ہر حکومت کا فرض ہے (وہ متحدہ ہندوستان کی حکومت ہو یا کسی پاکستانی گوشہ کی)، کہ وہ جب بُنیادی حقوق کا فیصلہ کرنے لگے تو یہ نہ سوچے کہ اس نے عوام الناس کے روٹی کپڑے اور رہائش، تعلیم اور صحت کا خیال رکھنا ہے یا نہیں جس شخص کے پاس کھانے کو روٹی۔ پہننے کو کپڑا۔ رہنے کو مکان۔ تعلیم کو مدرسہ اور بیماری سے صحت پانے کو طبّی امداد موجود ہو گی وہ انسانوں کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گا۔ ورنہ وہ خدا کی زمین پر زخمی جانوروں کی طرح رینگے گا۔ اور انسانیت کے لئے باعثِ فخر ہونے کی بجائے اس کے نام پر ایک دھبہ ہو گا۔

روٹی کپڑے اور مکان کے بعد تعلیم اور صحت کی باری ہے اس لئے آزادیٔ تحریر و

تقریر سے پہلے زندگی اور تربیت کی نوبت ہے۔ انسان زندہ ہونگے تو وہ پڑھ بھی لیں گے اور تحریر و تقریر کا کام بھی کرینگے۔ اگر وہ زندہ درگور ہونگے تو تقریریں اور تحریریں کیا بنائیں گی۔ سوائے اس کے کہ وہ طبقاتی کشمکش کو بڑھائیں۔

مذہبی آزادی

میں یہاں ایک لفظ مذہبی آزادی کے سلسلے میں بھی عرض کر دوں۔ مذہبی آزادی بہت عمدہ شے ہے لیکن اگر پیٹ میں روٹی اور بدن پر کپڑا نہ ہو تو مذہب کیا رہ جاتا ہے بھوکا آدمی خدا کو یاد کرے گا یا اپنی بھوک کا علاج ڈھونڈے گا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے ؎

شب جو عقد نماز بر بندم

چہ خورد بامداد فرزندم

"اگر میں رات کو نماز کی نیّت باندھوں تو صبح کو میرے بچّے کیا کھائیں گے"

جس شخص کے بچّے بھوکے ہوں اور بھوک کی رات ان پر گذری ہو وہ تو نماز پڑھ کر بھی اگر حلال کی روزی حاصل نہیں کر سکتا تو حرام کی روزی حاصل کرنے میں جان لڑائیگا اسی لئے تو بعض لوگ مسجد کے دروازوں پر بھی منڈلاتے ہیں کہ جب فارغ البال نمازی اللہ کے دربار میں سر جھکائیں تو مصیبت کا مارا انسان کسی کا جوتا اُٹھا کر اپنی اور اپنے بچّوں کی فاقہ کشی کا مداوا کرے۔ دُنیا عام طور پر جوتا چُرانے والوں کو مجرم سمجھتی ہے۔ مگر ان کا قصور کتنا ہی ہو اصل مجرم وہ سوسائٹی ہے جس میں لوگ جوتا چُرانے پر مجبور ہوں اور کسبِ حلال کی سبیل پیدا نہ کر سکیں۔ اس لئے یہ حکومت وقت کا فرض اوّلیں ہے کہ وہ لوگوں کو حرام خوری سے بچانے کے لئے کسبِ حلال کی راہیں کھولے۔

(۲۹)

حکومتوں کی کوتاہیوں کے نتائج

دولت کا ارتکاز

اگر حکومتوں نے یہی وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ عوام الناس کی کما حقہ امداد نہیں کرتیں۔ گو اُنہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ ہر فرد کو ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ اور ان کے راستے میں کوئی مانع نہیں۔ تاہم عملاً دولت مند طبقے کو ہر قسم کی سہولتیں ملتی ہیں اور غریبوں کی غریبی ہی ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

دولت کا مالک ہونے کے باعث امیروں کو حکومت اور اس کے مختلف اداروں میں دخل ہوتا ہے۔ جس کے باعث دولت کمانے کے مزید وسائل ان کے ہاتھ آتے ہیں۔ اور حکومت کو بھی انکی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ملک میں امیروں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جس میں کبھی کبھی غریبوں میں سے کوئی خوش قسمت بھی آکر شامل ہو جاتا ہے۔ یہ طبقہ حکومت، دولت

اور تعلیم پر قبضہ جمانا چاہتا ہے اور اپنی دولت اور اقتدار میں اضافہ کے درپے رہتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی کا ایک محدود طبقہ تو دُنیا کی نعمتوں سے وافر حصّہ پاتا ہے اور ایک بہت بڑا حصّہ روز بروز مفلس اور محتاج ہوتا جاتا ہے۔ ایک طرف زر و سیم کی کثرت ہوتی ہے دوسری طرف فقر و فاقہ کا ہجوم۔

دولت اور افلاس کا اجتماع

دولت اور افلاس کا اجتماع دُنیا میں بیشتر خرابیوں کا باعث ہو چکا ہے۔ دولت کی فراوانی امیر طبقے کو فقر و فاقہ سے بے نیاز کر کے نخوت اور تکبّر اور بالآخر گناہ پر مائل کرتی ہے۔

دولت مند اپنی دولت کے بل بوتے پر قریب و جوار کے غریبوں کے مکانوں اور زمینوں پر نگاہِ حرص و آز ڈالتا ہے۔ اور ہر مفید گوشے کو اپنی ملکیّت بنانے کی دُھن میں رہتا ہے۔ غریبوں کے ٹھکانے بیع اور نیلام ہوتے ہیں۔ اگر یہیں تک نوبت رہے تو خیر لیکن زمینوں اور مکانوں سے پہلے یا ان کے ساتھ یا ان کے بعد غریبوں کی بہو بیٹیوں کی عصمت کا شکار بھی ہونے لگتا ہے۔ امیر کے مقابلے پر غریب کی مجبوریاں اسے کچھ کرنے نہیں دیتیں اور اگر وہ کبھی تلملاتا بھی ہے تو امیر کے زبردست وسائل غریب کی کوئی پیش نہیں جانے دیتے۔ آخر کسی نہ کسی رنگ میں غریب بھی گناہ میں شامل ہوتا ہے۔ گناہ سے بچنا بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ امیر اکثر شوق سے گناہ کرتا ہے غریب اکثر مجبوری سے۔ القصّہ امیروں کی دولت اپنی آبادیوں میں گناہ اور فسق و فجور کے دروازے کھولتی ہے اور انجام کار اپنی ہی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ

عَلَیۡهَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِیۡرًا"۔ اور جب ہمیں کسی بستی کو برباد کرنا ہوتا ہے تو ہم اس کے دولت مندوں کو ظلم سے باز آنے کا حکم دیتے ہیں لیکن وہ اس میں فسق و فجور کرتے ہیں۔ پس وہ بستی اللہ کے وعدے کی حقدار ہوجاتی ہے۔ اور ہم اسے بالکل تباہ و برباد کردیتے ہیں"۔

امیروں کا فسق و فجور گرد و پیش کے لوگوں کو بھی تباہی کے گھاٹ اُتارتا ہے اور اس تباہی سے پھر ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ اگر نیا نظام بہتر نہ ہو اور پُرانے نظام کو دہرایا جائے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ زود یا بدیر پھر وہی تباہی سامنے آئے گی۔

حکومتوں کا تجربہ

دنیا کی بہت سی حکومتیں ایسی ہیں جنہیں ہر سال یہ شکوہ کرنا پڑتا ہے کہ تعلیم اور تربیت پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے باوجود جرائم کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی خاصیّت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ایک طرف امن قائم کرنے کے لئے پولیس، عدالتیں اور جیل خانے بنائے جاتے ہیں۔ لوگوں کو عدالت کے حوالے کرکے جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے۔ لیکن جرائم کم ہونے کی بجائے بڑھتے ہیں۔ تعلیم کے باوجود جُرم و گناہ میں اضافہ کیوں ہوتا جاتا ہے کیا فطرت انسانی میں قصور ہے کہ لوگ گناہ کے دلدادہ ہیں؟

نہیں نہیں۔ عام انسان گھریلو زندگی بسر کرنے کے حامی ہیں وہ جیلوں میں جانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن سوسائٹی کے غلط نظام نے عوام کے کثیر حصّہ کو گناہ و جرم پر مجبور کر رکھا ہے جس کے باعث ایک طرف تھانے۔ عدالتیں اور جیل خانے زیادہ ہوتے ہیں دوسری طرف جرم و گناہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس اضافے کے لئے خرچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس خرچ کا بوجھ پھر لوگوں پر پڑتا ہے۔ اور گو بہت سی رقم بظاہر امیروں کی جیب سے آتی ہے۔

لیکن فی الحقیقت ٹیکسوں کا سارا بوجھ مزدوروں اور کسانوں کی گردن پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب طبقہ بیش از بیش جرم و گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور امیر اور بھی بدکرداریوں کا شکار ہوتے ہیں اور آسان مواقع سے فائدہ اٹھا کر انتہائی بدکرداری سے کام لیتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ایک دائرہ سیئہ جاری ہوتا ہے۔ جُرم کو روکنے کے لئے سرکاری ادارے قائم کئے جاتے ہیں۔ سرکاری اداروں کے لئے زیادہ سے زیادہ ٹیکسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ٹیکسوں کا زیادہ بوجھ غریبوں پر پڑتا ہے۔ وہ جرائم پر مجبور ہوتے ہیں۔ جرائم کو روکنے کے لئے پھر سرکاری اداروں میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ غرضیکہ یہ سلسلہ لامتناہی جاری ہوتا ہے۔

دُنیا کی تاریخ جرائم پر نگاہ ڈالی جائے اور اعداد شمار کا معائنہ کیا جائے تو یہ حقیقت ہر طرف آشکار نظر آئے گی۔ خاص حالات ہی کبھی اس صورتِ حال کو بدلیں تو بدلیں ورنہ معمول تو وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔

متحدہ ہندوستان ہو یا پاکستان۔ یہ ملک ہو یا کوئی اور، جب تک اس کے ارباب بست و کشاد اپنی ابتدائی ذمہ داریوں کا احساس نہ کریں گے وہ کسی خطّہ ملک میں امن و امان قائم نہیں کر سکتے۔ بلکہ صورتِ حال کو سدھارنے کے لئے تو ضرورت ہے کہ ساری دنیا کے نظام کو بہتر طریق پر چلایا جائے۔ کیونکہ جب تک ساری دنیا میں ایک ہی جذبہ موجزن نہیں ہوتا امن و امان مفقود رہے گا۔

جنگِ عالم

یورپ نے بہت سی دولت اکٹھی کی۔ امریکہ اور جاپان نے بھی بہت سا مال و دولت جمع کیا۔ لیکن وہ مال و دولت کس کام آتا ہے یا لاآخر دولت کی ہوس دولت کے شوقینوں کو

ایک دوسرے سے لڑواتی ہے۔ نوعِ انسانی کا خون بہتا ہے۔ غریب کٹتے مرتے ہیں۔ امیر لشکروں کو لڑاتے ہیں۔ لیکن سرمایہ داری کی دُنیا دم بھر چین نہیں پاتی۔ مہذب۔ متمدن اور دولت مند دنیا کی آئے دن کی خونریز لڑائیاں ہی بتا رہی ہیں کہ موجودہ طریقِ حکومت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

جو لوگ متحدہ ہندوستان یا پاکستان میں پُرانے نظام کے مطابق طبقاتی وقار کو قائم کرنا اور اس کے ساتھ طبقاتی جنگ کو مول لینا چاہتے ہیں اُنہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی اپنی اُمنگیں اور تدبیریں ہی ایک دن ان کے لئے دامِ مصیبت بن جائیں گی اور راہِ فرار کو ان پر بند کر دیں گی۔ اس لئے سب سے پہلے بہی خواہانِ ملک و ملت کو یہ بتانا چاہئے کہ وہ ملک کے کسی گوشے میں کس طرز کی حکومت قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ کہاں تک حقیقت شناس ہیں۔ اور ان کی حقیقت شناسی سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اسمبلیوں اور ملازمتوں میں تناسب کی جنگ امیروں کے شوقِ رقابت کا مظاہرہ ہے۔ اس مظاہرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس پر انحصار بھی نہیں ہو سکتا۔ اصلی مسائل بالکل جداگانہ ہیں اور وہ نظروں سے عموماً اوجھل رہتے ہیں۔

(۳۰)

آخری باتیں

میں نے ہندوستان کے فرقہ وارانہ فیصلے کے سلسلے میں گزشتہ مضامین میں جو کچھ عرض کیا ہے، فی الحال اس پر مزید بحث غیر ضروری ہے۔ اب میں چند ایک گزارشات جو زیادہ تر بطور خلاصہ ہونگی عرض کروں گا۔

(۱) میں نے اس سلسلہ مضامین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی توجہ ضروری امور کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی ہے اور میں نے اپنے نقطہ نگاہ کو دوستوں کے سامنے رکھا ہے۔ میں مناسب یہی سمجھتا ہوں۔ کہ میں اپنے نام پر ہی بات کروں اور دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر نہ چلاؤں۔ اگرچہ اعتراضات سے بچنے اور اپنا دامن بچانے کا یہ سہل طریقہ ہے۔ لیکن یہ حل مقصد کے لئے میرے نزدیک مناسب نہیں۔

(۲) ہمارے فرقہ وارانہ فیصلے کا کوئی حل نہیں ہو سکتا جب تک صاف بیانی سے کام لے کر اور ذمّہ واری کا احساس کر کے مسائل پر غور نہ کیا جائے۔ لوگ پہلے تو گومگو میں رکھ کر

باتوں کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب بھی ان کا وقت آتا ہے تو پھر کروٹ بدلتے ہیں اور ناگفتہ بہ کیفیت پیدا کر کے اپنی راہ لیتے ہیں۔ جس سے صورت حال بد سے بدتر ہو جاتی ہے

(۳) مختلف فرقوں کے رہنماؤں کو اس کوشش میں نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کسی ہیر پھیر سے دوسروں کو اپنے دام میں پھنسا لیں گے اور مطلب نکال کر آرام سے بیٹھ جائیں گے قوموں، فرقوں اور جماعتوں کے سمجھوتے اپنی بنیادی استواری کی بدولت ہی امن و راحت کے کفیل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ آج کے معاہدات کل ردّی کی ٹوکری میں جا پڑینگے۔ جیسے کل کے معاہدات کے پُرزے آج مقتولوں اور مجروحوں کے خونِ جراحت چاٹ رہے ہیں۔ لفظی چالاکیاں ایسی شمشیریں ہیں جو گردنوں کو تاکتی ہیں۔

(۴) ہندوؤں کو بحیثیت اکثریت کے اپنی ذمہ واریوں کا احساس سب سے زیادہ لازم ہے۔ وہ حقوق کے طلبگار مگر ذمہ واریوں سے بے پروا ہیں۔ ان کی ذمہ واریوں کا ذکر اس سلسلۂ مضامین میں زیادہ نہیں آسکتا تھا۔ میں آیندہ ایک سلسلہ اور ترتیب دینا چاہتا ہوں، جس کا عنوان ہو گا:۔

"ہمارے بعض فرقہ وارانہ مسائل"

اس سلسلے میں مَیں کئی ایک باتیں لکھوں گا جن کی طرف ہندوؤں کو خاص توجّہ دینی ہو گی۔ مسلمانوں کے لئے بھی قابل توجّہ گزارشات ہوں گی۔ بہرحال ہندوؤں کی ذمّہ واریاں ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے بڑھ کر تھیں۔ اگر وہ ہندوستان کو متحدہ ملک بنانے کے آرزومند تھے لیکن تاحال انہوں نے اپنی ذمہ واریوں کا مناسب احساس نہیں کیا اور اگر بعض رہنماؤں نے کیا بھی تو عمومی اکثریت نے ان کی پیش نہیں جانے دی۔

(۵) مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کی موجودگی کو ہندوؤں نے متحدہ ہندوستان اور متحدہ قومیت کے منافی قرار دے کر ایسے کانٹے بونے کی کوشش کی ہے جو مدتوں باعثِ زحمت ہونگے۔ اور اسی حکمت عملی کا یہ اثر ہوا ہے کہ گزشتہ بیس برس میں حالات روبہ اصلاح ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہوتے چلے گئے۔

(۶) جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا جھگڑا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا اگر قوموں کے دل جُدا ہوں تو ان کو مخلوط انتخاب قریب لانے کی بجائے زیادہ دُور کردیگا۔ تپدق کا علاج یہ نہیں ہوتا۔ کہ مریض کو سہارے کے لئے لٹھ دے کر چلنے کو کہا جائے۔ مریض لٹھ سے سہارا عارضی طور پر لے سکے گا۔ مگر تپ دق کے رفع ہونے کی صورت نہ ہوگی ادھر اُدھر کے عارضی پیوند جامۂ قومیت کو زیبائش نہ دے سکیں گے۔

(۷) مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنا کام خود کرنیکا سبق حاصل کریں۔ ہم دنیا کی دوڑ میں بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ کبھی انگریزوں کے رحم و کرم پر جینے کی ڈھارس باندھنا، کبھی ہندو کی نظر التفات پر اُمید رکھنا ملی زندگی کے لئے سازگار نہیں ہوسکتا ہمیں اپنے عمل، اپنے ارادے، اپنی قربانی اور اپنے ایثار سے زندہ رہنا ہے اور دوسروں کو زندہ رہنے میں امداد دینا ہے۔ اگر ہم خود ہی اپنے دوست اور مددگار نہ ہوں تو دوسرے لوگ کب تک ہمارے یار و مددگار بنیں گے۔

(۸) دنیا میں کسی کے لئے کوئی گوشۂ عافیت نہیں ہے جس طرح ناروے۔ ڈنمارک ہالینڈ اور بلجیم میدان کارزار بنے۔ اسی طرح عراق۔ ایران اور سیام جیسے ملک لڑائی کی بھینٹ چڑھے۔ امریکہ اور روس جیسے جلیل القدر ممالک جنگ کے تیر کا ادنی شکار بن گئے۔

پھر کون ہے جو کسی گوشے میں پنپنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائیگا۔ زندہ قومیں زندہ نظام اور پائندہ محنت و قربانی کے طفیل ہی آزاد و سربلند رہ سکتی ہیں۔ جو تن آسانی کا خواہاں ہُوا وہ زندہ درگور ہُوا اور ہوگا۔

(۹) وطن اور قوم کا فیصلہ جغرافیائی حدود، نسلی وحدت، یکسانی، رنگ و زبان وغیرہ سے نہیں ہوتا۔ ترقی یافتہ دنیا میں اب تک خود غرضی کا دور دورہ رہا ہے۔ اس لئے ہر علم ہر فن، ہر دل اور ہر دماغ دوسروں کے قتل اور لوٹ کھسوٹ کے لئے برسرِ کار رہا ہے اور آج بھی اقصائے عالم میں برسرِ کار ہے۔ خود غرضی کا بیج جنگ کا جنگل پیدا کرتا ہے اس لئے ساری دنیا اس جنگ سے دوچار ہے۔ اگر جنگ کو دُنیا سے دُور کرنا ہے تو جذبہ ایثار کو ترقی دینے کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ ہر کوشش رائیگاں اور ہر عمل ضائع ہوگا۔

(۱۰) مذہب نے دنیا کو اچھے راستے پر چلانے کی کوشش کی ہے مگر مذہب کی جو بدنامی آج کی جارہی ہے وہ فی الحقیقت مذاہب کے بنیادی اصولوں کی بدولت نہیں ہورہی بلکہ ان معزز لوگوں کی بدکرداریوں کے سبب ہورہی ہے۔ جنہوں نے مذہب کی آڑ میں شکار کھیلنے کی عادت ڈالی ہے۔ اور مذہب کے ذمّے وہ باتیں لگائی ہیں جن کا مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ یا یوں کہیں کہ انسانوں کی بدکرداریوں نے ہر اچھے نظام کو گھناؤنا بنا کر پیش کیا ہے۔ اگر مذہب کا یہ حشر ہوسکتا ہے تو لامذہبی کا کوئی نظام بھی بہتر حالات پیدا نہیں کرسکتا۔ چند روز تک کبھی بہتری کے آثار پیدا ہونگے۔ اور پھر وہی اندھیرا چھا جائے گا۔ ان حالات میں مذاہب کا ہمدردانہ مطالعہ زیادہ مفید ہوگا۔ بجائے اس کے کہ مذاہب کو یکسر کالعدم کرنے کا فیصلہ کیا جائے۔ مذہب کی مخالفت ہی بہت سے وقت اور محنت کو بے نتیجہ بنا دیتی ہے۔

(۳۱)

سخنِ نو

ماہِ فروری ۱۹۴۲ء میں میں نے اپنے سلسلہ مضامین کو ختم کر دیا تھا لیکن وہ کتابی شکل میں ناظرین کی خدمت میں پیش نہ کیا جا سکا۔ اور غلط نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ جلد ہی ہندوستان کو ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہوا جس کا ذکر کئے بغیر مضمون بالکل ادھورا رہ جائے گا۔ فروری ۱۹۴۲ء کے زمانے میں ہی سر سٹیفورڈ کرپس کی لندن سے نئی دلی میں تشریف آوری کا اعلان ہو چکا تھا اور مارچ ۱۹۴۲ء نے سیاسیات ہند میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ سر سٹیفورڈ نے وزارت برطانیہ کی طرف سے آئینِ ہند کے بارے میں ایک اعلان پیش کیا۔ میں اس اعلان کو اور اس پر تنقید کو انہیں الفاظ میں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے اس وقت استعمال کئے۔

سر سٹیفورڈ کرپس کی تجاویز

آخر کار وہ سورج طلوع ہو ہی گیا جس نے سر سٹیفورڈ کرپس کی صیغۂ راز میں گردش

کرنے والی تجاویز کو منظر عام پر پیش کر دیا مختصر یہ کہ حکومت برطانیہ مذکورہ ذیل اعلان کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ ہندوستانیوں کے متعلقہ گروہ یا فرقے ان تجاویز سے اتفاق رائے کا اظہار کریں۔

ملک معظم کی حکومت نے برطانیہ اور ہندوستان میں ظاہر کئے گئے ان خدشات کے پیش نظر کہ ہندوستان کے مستقبل کے متعلق جو وعدے کئے گئے ہیں وہ پورے ہونگے یا نہیں۔ یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ واضح اور صاف الفاظ میں ان تجاویز کو پیش کر دے جو ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے جلد از جلد قیام کے بارے میں وہ اختیار کرنا چاہتی ہے مقصد یہ ہے کہ ایک نیا ہندی اتحاد (انڈین یونین) قائم کیا جائے جو ایک نوآبادی کی حیثیت رکھیگا اور برطانیہ اور دوسری نوآبادیوں کے ہمراہ تاج برطانیہ کا مشترکہ وفادار ہوگا لیکن ہر طرح سے ان کے مساوی حیثیت رکھے گا اور اندرونی یا بیرونی معاملات میں کسی شکل میں بھی ماتحت نہ ہوگا پس ملک معظم کی حکومت ذیل اعلان کرتی ہے :-

(ا) جنگی کارروائیاں ختم ہونے کے فوراً بعد ہندوستان میں ایک منتخب شدہ جماعت (جس کے انتخاب کا طریقہ بعد میں دیا گیا ہے) قائم کی جائے گی۔ اور اس کے ذمہ یہ کام ہوگا کہ وہ ہندوستان کا نیا آئین مرتب کرے۔

(ب) اس طریقہ پر جو بعد میں دیا گیا ہے اس آئین ساز جماعت میں ہندوستانی ریاستوں کی شمولیت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔

(ج) ملک معظم کی حکومت وعدہ کرتی ہے کہ ایسے مرتب شدہ آئین کو فوراً منظور کریگی۔ اور اس پر عمل درآمد بھی کرے گی ماسوا اس کے کہ

(۱) برطانوی ہند کے کسی صوبہ کو جو مجوزہ آئین میں شامل نہ ہونا چاہے اپنی موجودہ آئینی ہستی برقرار رکھنے کا حق ہوگا اور اگر آئندہ کسی وقت میں شامل ہونا چاہے تو اسی کی گنجائش رکھی جائے گی۔

ایسے شامل نہ ہونے والے صوبے اگر چاہیں گے تو ملک معظم کی حکومت تیار ہوگی کہ ان کو "ہندی اتحاد" کے درجے کا نیا آئین دیدے جو اسی طریقہ پر تیار کیا گیا ہو جس کا ذکر آچکا ہے۔

(۲) ملک معظم کی حکومت اور اس آئین ساز جماعت کے درمیان ایک معاہدہ طے ہو اور اس پر دستخط کئے جائیں۔ اس معاہدہ میں وہ تمام ضروری امور شامل ہونگے جو کل ذمہ داری کو انگریزی ہاتھوں سے ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کریں گے۔ اس معاہدے میں ملکِ معظم کے وعدوں کے مطابق نسلی اور مذہبی اقلیتوں کی حفاظت کی تدابیر ہونگی۔ لیکن اس میں کوئی ایسی تجاویز نہ ہونگی جو مستقبل میں "ہندی اتحاد" پر برطانوی دولت مشترکہ" کی دوسری سلطنتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں پابندی عائد کریں۔

کوئی ہندوستانی ریاست اس آئین میں شامل ہو یا نہ ہو یہ لازم ہوگا کہ اس کے معاہدوں پر اس حد تک نظرِ ثانی کی جائے جس حد تک کہ نئے آئین کا اس سے تعلق ہے۔

(د) مجلس آئین ساز کی تشکیل حسب ذیل ہوگی ماسوا اس صورت کے کہ ہندوستانی رائے عامہ کے بڑے فرقوں کے رہنما جنگی کارروائیاں ختم ہونے سے پہلے کسی اور شکل پر متفق ہوں۔

صوبجاتی انتخابات کے نتائج جاننے کے فوراً بعد اور انتخابات کا جنگی کارروائی

ختم ہونے کے بعد منعقد ہونا ضروری ہوگا) صوبہ مجالس قانون ساز کے نچلے ایوان کے سب ارکان ایک واحد انتخابی کالج کی طرح مجلس آئین ساز کا انتخاب نمایندگی متناسبہ کے طریق پر کرینگے۔ اس نئی مجلس کی تعداد انتخابی کالج کی تعداد کا تقریباً دسواں حصّہ ہوگی۔

ہندوستانی ریاستوں کو بھی دعوت دی جائے گی کہ وہ برطانوی ہند کی طرح اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق اپنے نمایندے مقرر کریں جنہیں وہی اختیارات ہونگے جو برطانوی ہند کے نمایندوں کو ہوں گے۔

(د) اس نازک دور میں جو ہندوستان کے سامنے ہے اور جب تک کہ نیا آئین مرتب نہیں ہوتا، ملک معظم کی حکومت لازماً دفاع ہند کی ذمہ داری برداشت کریگی اور عالمگیر دفاع کی جنگی کوششوں کے ایک حصّہ کے طور پر اس کو اپنے اختیار اور ہدایت کے ماتحت چلائے گی۔ لیکن ہندوستان کے مکمل فوجی اخلاقی اور مادی ذرائع کو منظم کرنے کا کام حکومت ہند کے ذمہ ہوگا جو جمہور ہند کے تعاون سے کیا جائے گا۔ ملک معظم کی حکومت خواہش کرتی ہے اور دعوت دیتی ہے کہ ہندوستانی جمہور کے بڑے بڑے فرقوں کے رہنما اپنے ملک، دولتِ مشترکہ برطانیہ اور اقوام متحدہ کے مشوروں میں فوری اور مؤثر حصّہ لیں۔ اس طرح وہ ایک ایسے کام میں سرگرم اور تعمیری امداد دینے کے قابل ہو جائیں گے جو ہندوستان کی آیندہ آزادی کے لئے ضروری اور لابدی ہے۔

اعلان کی حقیقت

یہ ہے وہ مکمل اعلان، جس کی تفسیر میں سر سٹیفورڈ نے لب کشائی بھی کی ہے۔ اور جس کے بارے میں کئی روز سے مشورے بھی ہو رہے ہیں۔ اس مجوزہ اعلان کے خد و خال حسب ذیل طریق پر آسان اور سادہ الفاظ میں بیان کئے جا سکتے ہیں:۔

(۱) موجودہ وقت میں ہندوستان کے دفاع کی ذمہ داری ہندوستانیوں کے سُپرد کی جاسکتی۔ کیونکہ جنگ کا انتظام ایک عالمگیر نوعیّت پر کیا جارہا ہے۔ یہ کام نئے ہندوستانی ہاتھوں میں نہیں سونپا جاسکتا۔ ہندوستان کے اندر اور باہر ہندوستانی یا برطانوی فوجیں کہاں کہاں رکھی اور لڑائی جائیں گی۔ یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ اس لئے دورانِ جنگ میں ہندوستانی رہنما فوجی قوت میں اضافہ کرنے، سامانِ جنگ کی تیاری کو ترقی دینے اور دیگر مالی و مادی وسائل کو بہم پہنچانے کا کام تو کرسکتے ہیں اور ہندوستان اور بیرونِ ہند کے مشوروں میں بحیثیت ایک فریق کے شامل ہوسکتے ہیں۔ مگر وہ فوجی قوت سے کام لینے کا فریضہ ادا نہیں کرسکتے۔

کانگرس مسلم لیگ۔ ہندو مہا سبھا۔ اعتدال پسند اور دیگر کئی ایک جماعتیں بار بار مطالبہ کرچکی ہیں کہ دفاع کا کام ہندوستانیوں کے سپرد کیا جائے۔ برطانوی حکومت نے یہ سمجھا ہے کہ یہ مطالبہ محض سوداگرے کے لئے ہے ورنہ لوگ اس پر مصر نہیں ہونگے۔ دیکھیں برطانوی حکومت کی رائے درست ثابت ہوتی ہے یا ان ہندوستانی رہنماؤں کا مطالبہ حقیقت پر مبنی ثابت ہوتا ہے۔ جو اپنی اپنی جماعتوں کی طرف سے دفاع کی ذمہ داری لینے کی پکار کررہے تھے۔

(۲) کانگرس کے نمائندہ اسمبلی کے مطالبہ کو اس حد تک تو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ایک منتخب شدہ آئین ساز مجلس قائم کی جائے گی لیکن یہ مجلس موجودہ حق رائے دہی کی بنا پر قائم ہوگی۔ حق رائے دہی بالغان کی شرط کو حذف کردیا گیا ہے۔ مگر اس قدر گنجائش موجود ہے کہ اگر ہندوستان کے بڑے بڑے فرقوں کے رہنما کوئی متفقہ متبادل تجویز پیش کریں تو اس پر عمل درآمد کیا جائیگا۔ اس لئے اگر حق رائے دہی بالغان

پر اتفاق رائے ہو جائے تو نیا انتخاب اس بنا پر بھی ہو سکے گا۔ لیکن اس میں کافی وقت صرف ہو گا۔ نئی فہرستیں تیار کرنی پڑیں گی۔ اور اس طرح معاملہ تاخیر میں پڑ جائے گا۔

مجوزہ مجلس آئین ساز کو صوبوں کے تو منتخب شدہ ارکان اسمبلی منتخب کریں گے۔ لیکن ریاستوں کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہے کہ نمایندے نامزد ہوں گے یا منتخب۔ اس حالت میں اگر کوئی ریاست برطانوی ہند سے تعلق جوڑنا بھی چاہے گی تو وہ نامزدگی کی بجائے انتخاب کو کم ہی پسند کریگی۔ پس اندیشہ ہے کہ شاید مختلف رجحان طبیعت کے لوگ ریاستوں کے رئیسوں کی طرف سے نامزد ہو کر آ جائیں۔

(۳) صوبوں کو نمایندے بھیجنے کا حق ہو گا۔ وہ مجلس آئین ساز کو مرتب کرینگے لیکن کوئی صوبہ مجبور نہ ہو گا کہ وہ مجلس آئین ساز کے فیصلہ کے بعد ضرور ہی اس آئین میں شامل ہو جو صوبہ یا صوبے کے آئین سے مطمئن نہ ہوں وہ علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ اور "ہندی اتحاد" کے برابر کی حیثیت ان کو حاصل رہے گی۔ وہ اپنا علیحدہ اتحاد یا وفاق قائم کر سکیں گے۔ مگر انہیں پھر اسی قسم کی مجلس آئین ساز کے ذریعے معاملات طے کرنا ہونگے۔

صوبوں کو علیحدگی کا حق دے کر پاکستانی ذہن کو ساتھ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن مجوزہ اعلان کی تفسیر کرتے ہوئے سر سٹیفورڈ نے کہا ہے کہ علیحدگی کے قطعی ہونے کے لئے کم و بیش ۶۰ فی صدی رائے کی ضرورت ہو گی جو ٹھوس اکثریت کہلاتی ہے گویا کسی صوبے کے ساٹھ فی صدی ارکان اسمبلی علیحدگی کے حق میں ہوں تو علیحدگی قطعی ہو گی۔ پس پنجاب، بنگال اور سندھ میں موجودہ آئین کے ہوتے ہوئے سب مسلمان

کے یک زبان ہونے پر بھی علیحدگی کی گنجائش قطعی نہیں۔

البتہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر علیحدگی کے حق میں ۶۰ فی صدی سے کم اکثریت ہو تو اقلیت کو حق ہوگا کہ وہ رائے عامہ سے استصواب کا مطالبہ کرے۔ اس لئے نئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ مثلاً

(I) چونکہ معیار رائے دہی دولت اور تعلیم پر مبنی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی تعداد مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی آبادی کے تناسب کے مطابق نہیں پس پنجاب، بنگال اور سندھ میں رائے عامہ اگر حق رائے دہی بالغان کی شکل میں نہ ہو، تو مسلمان خسارے میں رہیں گے۔

(II) چونکہ بہت سے مسلمان ایسے علاقوں میں آباد ہیں جو غیر مسلموں کے زیر اثر ہیں یا ایسے کام کرتے ہیں جن میں ان کی روزی کا دار و مدار غیر مسلم لوگوں پر ہے۔ اس لئے ان پر دونوں طرف سے گہرا دباؤ پڑے گا۔

(III) پنجاب، بنگال اور سندھ کے صوبے فرقہ وارانہ پروپگنڈا کے شکار ہونگے پاکستان کے حق میں اور اس کے خلاف طوفانی تحریکیں جاری ہونگی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو، دس کروڑ آبادی کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور نہ ان صوبوں کا متحدہ ہندوستان میں جانا اور نہ علیحدہ رہنا مسلم اور غیر مسلم آبادی میں طرح تعاون ڈال سکے گا۔

اس صورت حال کا اثر باقی علاقوں پر بھی ضرور پڑے گا۔ پھر جو حشر برپا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پاکستان کے موافق یا مخالف شدید رائے رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہی بخوبی جانتے ہیں کہ ان کے خلاف فیصلہ ہونے کی صورت میں وہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے۔

ایک صوبہ سرحد ہی ایسا صوبہ ہے جہاں اسمبلی کی ساٹھ فی صدی اکثریت بھی اگر مسلمان چاہیں تو آسانی سے حاصل ہو سکے گی اور آبادی کا حجم غفیر بھی اگر چاہے تو علیحدگی کا فیصلہ کر سکے گا۔ گو یہاں کے عام علیحدگی کے خلاف کسی حد تک ہے۔ تاہم آنے والے دور کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ عام رجحان یہی ہوگا موجودہ رجحان میں کافی تبدیلی ہونے کا امکان غیر موجود نہیں۔

لیکن صوبہ سرحد اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کے قابل نہیں وہ مرکز سے امداد نہ لے سکیگا۔ اگر وہ علیحدگی اختیار کرے۔ اور سر سیٹفورڈ نے کہدیا ہے کہ برطانوی حکومت کوئی امداد نہ کرے گی اس لئے تنہا صوبہ سرحد کو کام کرنا مشکل ہوگا۔ اور اگر وہ اخراجات کو کم کرکے گذارے کی صورت نکالے تو بھی ایک علیحدہ وحدت کے طور پر اس کا قائم رہنا دشوار ہے۔

مختلف جماعتوں کے تاثرات

یہ مسئلہ مسلم لیگ۔ کانگریس۔ مہا سبھا وغیرہ کے لئے عام طور پر اور سکھوں کے لئے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اس کا سلجھنا مشکل ہے۔ اور اگر آج لفظوں کے ذریعہ اس کو حل کرنا ہے تو کل شاید ہتھیاروں کی نوبت آئے۔ ان حالات میں نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی فریق بھی مجوزہ فارمولا کو قبول کرکے آگے بڑھے گا۔ ہندوؤں اور سکھوں کو خوف ہے کہ مسلم اکثریت پاکستان بنانے کی کوشش کرے گی اور برطانیہ اس کا ساتھ دیگا۔ اور مسلمانوں کو خوف ہے کہ ہندو اور سکھ پاکستانی اسکیم کو شکست دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور مجوزہ حالات میں شاید وہ کامیاب ہو جائیں۔ اس لئے شاید کوئی فریق بھی اس اسکیم کو قبول کرنا پسند نہ کرے۔

گزشتہ پانچ برس میں حالات اس نازک حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اب ان کو سنوارنے کی کوشش آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جو ہندو اور سکھ پنجاب اور بنگال میں موجودہ آئین کے ماتحت مخلوط انتخاب سے مسلمانوں کو ایک نشست کی اکثریت دینے کو تیار نہ تھے وہ آزاد بنگال اور آزاد پنجاب میں کیسے مسلم اکثریت کی ماتحتی قبول کرینگے۔ جب ان کی پوزیشن یہ ہو تو مسلمان سارے ہندوستان میں مستقل ماتحتی کی صورت کیونکر قبول کریں۔

پس سر سٹیفورڈ کرپس کا کام اتنا آسان نہیں جتنا بعض لوگ سمجھ رہے تھے۔ البتہ ان کی تجاویز ایسی ہیں کہ جو امریکہ اور دوسرے ملکوں میں عام پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی اس لئے ناکامی کی ذمہ واری ہندوستانیوں کے سر رہے گی۔ اور برطانیہ اتحادی دنیا کی رائے عامہ کو اپنا زیادہ ہمنوا بنا سکے گا۔

دیکھیں مختلف جماعتوں کے راہنما جو گفتگوؤں میں پیش پیش رہے ہیں کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

(۳۲)

سر سٹیفورڈ کی تجاویز کے بعد

ایک ماہ کی گفت و شنید کے بعد آخر وہی ہوا جس کی خبر میں نے اپنے مضمون میں دی تھی۔ کانگرس، مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا وغیرہ سب جماعتوں نے اپنی اپنی وجوہات کی بنا پر کرپس تجاویز کو نامنظور کر دیا اور سر سٹیفورڈ خوشی خوشی ولایت تشریف لے گئے اور ولائیت جا کر انہوں نے ایوانِ عام میں وہ وجوہات بیان کیں جن کے باعث ان کی دانست میں ان تجاویز کو نامنظور کیا گیا۔ اس سلسلہ مضامین میں ان مباحث کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بڑی حد تک ہماری بحث سے خارج ہیں البتہ اس سلسلہ مضامین کو علیحدہ شائع کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ افادہ عام کے لحاظ سے سیاست کے یہ گوشے بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں۔

پاکستان اور راجگوپال اچاریہ

سر سٹیفورڈ کرپس کی واپسی کا ایک اثر یہ ہوا کہ بعض طبیعتوں نے ہندو مسلم مفاہمت

کی خاطر اپنے پرانے رویّہ میں تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ اس گروہ میں مسٹر راجگوپال ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے کہنا شروع کیا کہ حکومت برطانیہ کے سامنے متحدہ محاذ پیش کرنے کے لئے پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے اور اس طرح معاملہ کو سلجھانے کی طرف ایک اور قدم اٹھایا جائے۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے یہ تجویز کانگرس کی مجلس عاملہ میں پیش کرنے سے پہلے اس کا اظہار اخبارات میں کر دیا اور الہ آباد کے اجلاس مجلس مرکزیہ کانگرس میں اس بارے میں اچاریہ جی کے رویّہ کے خلاف شکایت اور ان کے نئے نقطۂ نگاہ پر بحث وتمحیص بھی ہوئی۔

مولانا آزاد اور دیگر کانگرسی رہنماؤں نے اچاریہ جی کے نظریّہ کی سختی سے مخالفت کی اور بالآخر انہیں ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ کانگرسی رہنما اس مرحلہ پر بھی پاکستان کے اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ بعد میں مسٹر راجگوپال اچاریہ کو کانگرس کے عہدوں بلکہ رکنیت سے بھی علیحدہ ہونا پڑا اور کانگرس نے ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان کے اصول کو تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ دیدیا۔ گویا اس طرح سر سٹیفورڈ کی واپسی کے بعد بھی مسئلہ کو نئے اسلوب پر سلجھانے کی سعی وکوشش بیکار ثابت ہوئی۔

ساورکر کا مندر

اس زمانہ میں ہندو مہاسبھا کے صدر مسٹر ساورکار نے ہندوستان کو مندر سے تشبیہ دے کر فرمایا کہ اس مندر کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ لیکن مسٹر ساورکر اس بات کو بھول گئے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ کیا ہے۔ اُنہوں نے مسٹر راجگوپال اچاریہ کی ہندو خاندان مشترکہ کی تشبیہ کو تو غلط قرار دیا اور یہ ماننے سے انکار کیا کہ ہندوستان ایک مشترکہ خاندان ہے اور اگر اس کے شریک باہم اکٹھے

نہیں رہ سکتے تو وہ علیحدہ ہو جائیں تو بیجا نہیں۔ انہوں نے تقسیم کو رد کرنے کے لئے ہندوستان کو ایک مندر قرار دیا۔ مگر یہ بھول گئے کہ اس مندر میں مسجد آباد کرنے والوں کا بھی حصہ ہے اور ان کے لئے مسجد کا ٹھکانہ کہیں نہ کہیں رکھنا پڑیگا۔ خاندان مشترکہ کو تقسیم سے روکنا آسان ہے لیکن مندر کا نام لے کر مسجد والوں کو ساتھ رکھنا ناممکن ہے۔ اس طرح مسٹر ساورکار نے اپنی دلیل کے جوش میں اپنے ہی مقصد پر ضرب لگائی اور تقسیم ہند کے اصول کی عملاً حمایت کردی۔ گو لفظاً وہ تقسیم کے خلاف ہی دلیل دے رہے تھے۔

گاندھی جی اور راجگوپال

اواخر ماہ مئی ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے "ہریجن" کے ایک مضمون میں مسٹر راجگوپال اچاریہ کے پاکستانی نقطہ نگاہ پر تبصرہ فرمایا۔ مناسب ہوگا کہ میں اس سلسلہ میں اپنے ایک مضمون کے ضروری حصے درج کردوں جو اسی زمانے میں سپرد قلم کیا گیا۔

"گاندھی جی نے "ہریجن" کے ایک مضمون میں جو اواخر ماہ مئی میں شائع ہوا مسٹر راجگوپال اچاریہ کے پاکستانی نقطہ نگاہ پر تبصرہ فرمایا ہے۔ آپ نے لوگوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اچاریہ جی کے خیالات کو صبر و سکون سے سُنیں۔ اور ان کے جلسوں میں بدنظمی پیدا نہ کریں۔ کیونکہ جمہوریت نہیں چل سکتی اگر فریق مخالف کی بات کو نہ سُنا جائے۔ اور نہ حق و صداقت اختیار کی جاسکتی ہے اگر دوسری طرف کی بات پر کان ہی نہ دھرے جائیں یا اُسے سُن کر اس کا مذاق اُڑا دیا جائے۔ گاندھی جی کی یہ ہدایات اس قابل ہیں کہ مسلمان ان پر خاص توجہ دیں۔ اور ایک دوسرے کی آواز کو دبانے کے لئے نامناسب طریقے اختیار نہ کریں۔ جن کے باعث اُمتِ اسلامیہ میں انتشار اور عداوت کا بیج بویا جارہا ہے۔

جہاں تک مسٹر راجگوپال اچاریہ کے زیر بحث نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے گاندھی جی نے فرمایا ہے کہ

"قارئین جانتے ہیں کہ میں راجہ جی کو غلطی پر سمجھتا ہوں وہ غلط ماحول پیدا کر رہے ہیں۔ نہ ان کو پاکستان پر یقین ہے اور نہ قوم پسند مسلمانوں کو، یا ان دوسرے لوگوں کو جو حق علیحدگی کی تائید کر رہے ہیں۔ وہ اور راجہ جی کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو علیحدگی کے مطالبہ سے ہٹانے کا یہی ایک راستہ ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ بہت سے مسلمان ایک مشتبہ قدر و قیمت کی رعایت پر خوش ہو رہے ہیں۔ میں تو اس میں آئندہ تنازعات کے بیج کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا۔ یہ کہدینا کافی ہونا چاہئے کہ اگر مسلمان علیحدہ ہونا ہی چاہیں تو مسلم لیگ کو علیحدگی سے کوئی روک نہیں سکتا۔ مسلمان یا تو ووٹ سے اور یا تلوار سے اسے حاصل کر ہی لیں گے۔ اگر وہ ثالثی پر رضامند ہونا منظور نہ کریں۔"

ان فقرات کو قلمبند کرنے کے بعد گاندھی جی نے اپنی پوزیشن کو مزید واضح کرنا مناسب سمجھا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ

"لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر برطانوی قوت ہندوستان سے بالکل ہٹا لی جائے۔ اور جاپانی خطرہ دور ہو جائے، اس وقت تک نہ پاکستان ہے نہ ہندوستان اور نہ کوئی اور ستان۔ آج کل تو یہ انگریزستان ہے۔ اور شاید کل کو جاپانستان ہو جائے۔ اگر ہم احتیاط نہ کریں۔ وہ سب لوگ جو اب اور مستقبل میں ہمیشہ ہندوستان کو اپنا گھر سمجھتے ہیں، اپنی ساری قوت سے کام لیں تو وہ اسے موجودہ اور آئندہ خطروں سے بچا سکتے ہیں۔ اور جب یہ دونوں خطرے مطلقاً دور ہو جائیں تو پھر پاکستان یا کسی اور ستان کے ذکر کا وقت ہوگا۔ اور وہی وقت راضی نامے یا جنگ سے فیصلہ کرنے کا ہوگا۔

کسی تیسرے فریق کو ہماری قسمت کا فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ فیصلہ راضی نامہ یا تلوار سے ہوگا راجہ جی کا طریقہ ہمیں کوچۂ سربستہ میں لے جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کا وطن پروانہ ناقابلِ ستائش اصرار ان کے لئے اور ہم میں سے کسی کے لئے نامعلوم راستہ کھول دے مختلف آراء کا خواہ کچھ ہی انجام ہو۔ میں بہرحال باہمی رواداری اور احترام کی درخواست کروں گا۔"

گاندھی جی کے ارشادات کو میں نے تفصیل سے قلمبند کر دیا ہے تاکہ مجھ پر قطع و برید کا الزام نہ آئے۔ لیکن میں اس مضمون کے بارے میں چند ایک گذارشات کرنا ضروری سمجھتا ہوں :۔

اوّل۔ گاندھی جی ارشاد فرماتے ہیں کہ "آج کل تو یہ انگریزستان ہے۔ اور شاید کل کو جاپانستان ہو جائے۔ اگر ہم احتیاط نہ کریں" اگر ہم احتیاط نہ کریں کا جملہ ہی اس تشریح کا طالب ہے جس کا تذکرہ راجہ جی فرما رہے ہیں۔ اگر ہم نے اس وقت کچھ بھی نہیں کرنا ہے تو وہ احتیاط کونسی ہے جس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ راجہ جی اور ان کے ہمنوا ہندو اور مسلمان تو اسی احتیاط کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ لیکن خود گاندھی کو یہ احتیاط کا راستہ مطلوب نہیں۔

دوم۔ گاندھی جی فرماتے ہیں کہ "جب یہ دونوں خطرے (یعنی انگریزی اور جاپانی خطرے) کلیتہً دور ہو جائیں تو پھر پاکستان یا کسی اورستان کے ذکر کا وقت ہوگا۔ اور وہی وقت راضی نامے یا جنگ سے یہ فیصلہ کرنے کا ہوگا۔"

گاندھی جی کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے اور آسکتی ہے کہ انگریزی اور جاپانی خطرے موجودہ حالات میں وطن پروروں کی محنت اور قربانی سے کلیتہً دور ہو جائیں گے۔

اور پھر ساری دنیا سانس روک کر ہندوؤں اور مسلمانوں کی فیصلہ کن جنگ یا راضی نامہ کا انتظار کریگی۔ اگر دنیا نے ایسا انتظار ہی کرنا ہوتا تو فرانسیس اور انگریز یا ولندیز اور پرتگیز ہندوؤں اور مسلمانوں، مرہٹوں اور مغلوں یا ٹیپوؒ اور نظام کو جنگ یا راضی نامے سے فیصلہ کرنے کا موقعہ دیتے۔ اور کبھی درمیان میں نہ آتے۔ مجھے تو دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ گاندھی جیسی قابل قدر شخصیت گذشتہ تاریخ کے اوراق کو پسِ پُشت ڈال رہی ہے۔ اور مستقبل کی تاریخ کے متعلق افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہے آج کا ہندوستان ایسا بے حقیقت خطہ زمین نہیں جس کو دُنیا بھُلا کر بیٹھ جائے گی۔ اور یہاں کے باشندوں کو باہمی جنگ و جدال یا راضی نامہ سے فیصلہ پر آنے کا موقع دے گی۔

سوم۔ مجھے تو گاندھی جی سے یہ سوال کرنا ہے کہ اگر انگریزوں کی قوت کے ہندوستان سے جانے پر ہی سب معاملات کا انحصار ہے تو آپ نے ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کو ہاتھ میں لے کر برطانوی حکومت کو چیلنج کیوں دیا۔ اور درجہ نوآبادیات کا مطالبہ کیوں کیا۔ آپ نے نہرو رپورٹ کی بنا پر چیلنج دے کر سکھوں سے کیوں کہا کہ نہرو رپورٹ کا پنجاب والا فارمولا سکھوں سے بے انصافی کرتا ہے۔ آپ نے آزادی کامل کی قرارداد لاہور کانگرس میں منظور ہو جانے کے بعد فیصلے کے پندرہ نکات کیوں بیان فرمائے۔

اس سے بھی مزید وضاحت کے لئے میں یہ دریافت کروں گا۔ کہ گول میز کانفرنس پر جا کر ہندوستان اور ہندوستانی اقلیتوں کے مسئلے پر بحث و تمحیص کیوں کی گئی۔ اور اب بھی انگریزوں سے محکمہ دفاع اور تمام ملکی امور کا مطالبہ کیوں ہو رہا ہے حالانکہ

جاپانی خطرہ دُور نہیں ہوا۔ اور انگریزی خطرے سے اُمیدیں وابستہ کی جا رہی ہیں۔
ہمیں تو آج تک یہی نظر آیا کہ جاپانی اور انگریزی خطروں کی موجودگی میں اپنی مرضی کے مطابق راضی نامہ کی کوشش کی گئی۔ اور کبھی ان دونوں خطروں کے دور ہو جانے تک فرقہ وارانہ مسائل کو اٹھا نہ رکھا گیا۔ اگر ایسا کرنا تھا تو ۱۹۳۷ء میں وزارتیں مرتب کر کے ہندو مسلم تنازعات کا فیصلہ کرنے، لوگوں کو قید و بند میں ڈالنے بلکہ گولیاں تک چلانے کا حق کیوں حاصل کیا گیا۔ اگر انگریزی خطرے کے ہوتے ہوئے وزارتیں مرتب ہو سکتی ہیں تو باقی امور کا فیصلہ کرنے کے لئے خطروں کے دُور ہونے کا یا بہ الفاظ دیگر قیامت کا انتظار کرنا کیوں ضرور ہے۔

چہارم۔ جب انگریزی اور جاپانی خطرے کے دور ہو جانے کے بعد تلوار سے فیصلہ ہونے کی گنجائش ہے تو پھر فریقین تلوار سے فیصلہ کرنے کی سوچیں گے اور اسی سرفگن فیصلے کے لئے ہمہ تن تیاری میں مصروف رہیں گے۔ یہ تیاریاں ایسی نہیں ہوں گی کہ ان کے بعد راضی نامے کی گنجائش ہو۔ پھر تو فتحیاب مذہب ہی اپنی شرائط بہ جبر منوائے گا۔ اور شکست خوردہ مذہب اپنی مجبوریوں کی گرہ کاٹنے کی فکر میں رہیگا۔

پنجم۔ گاندھی جی کو انگریزی اور جاپانی خطرہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان اور جرمنی کے درمیان روس کا تھکا ماندہ مگر حوصلہ مند لشکر ہی حائل ہے۔ وہ کسی صورت درمیان سے ہٹ جائے تو جاپان سے جلد جرمنی ہندوستان کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور بھی کئی ایک خطرے مستقبل میں درپیش آ سکتے ہیں۔ خطروں کا مقابلہ اگر متحد ہو کر کرنا تھا تو پہلے ہی فرقہ وارانہ مسائل میں دخل نہ دیا ہوتا۔ اور اگر دخل دیا جا چکا ہے اور کانگرس اس بارے میں اپنی خطاؤں کے بار سے سبکدوش نہیں

ہو سکتی۔ تو اب دنیا کو وہ درس دینا جس کے خلاف اس کا اپنا تلخ تجربہ موجود ہے۔ ہمیں کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔

ششم۔ جو ہندو یا مسلمان پاکستان پر یقین نہ رکھتے ہوئے بھی اس کے اصول کو تسلیم کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ ان کا مقصد تو یہی ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لو تاکہ مستقبل میں خطرات کو از سرِ نو دعوت نہ دی جائے۔ خانہ جنگی کا دروازہ نہ کھلے اور نہ قومیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیاری کریں اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے گا تو مسلمانوں کا ووٹ فیصلہ کر سکے گا کہ پاکستان چاہیئے ہے یا نہیں اور یہ فیصلہ ناطق ہوگا۔ اگر ہندو اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور نہیں کرنا چاہتا تو مسلمانوں کو ہندوؤں سے جنگ کے لئے تیار رہنا ہے اور گاندھی جی اپنے سب عدم تشدد کے باوجود ہمیں یہی راستہ دکھاتے ہیں تو ہم ہرگز یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ مسلمان پاکستان کے بارے میں دو رائیں رکھ کر جھگڑا جاری رکھیں۔ اور ہندو دونوں کو لڑا کر ان دونوں کے خاتمہ کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہوتے رہیں۔

ہم نے گاندھی جی اور دوسرے ہندو لیڈروں بلکہ بعض قوم پرور مسلم رہنماؤں کے طریق کار کا نتیجہ یہی محسوس کیا۔ اور اسی لئے ہم نے مسلمانوں میں پاکستان کے جھگڑے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر ہندو اکثریت مسلمانوں کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی رائے سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ بلکہ جنگ کے لئے تیار ہوں تو سب مسلمانوں کو ایک ہی راستے پر چلنا ہوگا۔ اس لئے گاندھی جی ہی ہمیں بتائیں کہ ہم جنگ کے لئے تیاری کیوں کریں۔ اور صلح کے راستے پر کیسے چلیں؟ کیا ان کا طریق کار ہمارے لئے کوئی اور راستہ باقی چھوڑتا ہے؟

سارے ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونا مشکل ہے اگر راجگوپال اچاریہ کی بات ہندو تسلیم نہیں کر سکتا تو مسلمانوں کو ہندوؤں پر اور کانگرس کے رہنماؤں پر کہاں تک اعتبار ہو سکتا ہے۔ ابھی وقت ہے اسے ضائع نہ کرو۔ اور بیس برس کی غلط کاریوں کے نقصان کی تلافی کے درپے ہو جاؤ۔ ورنہ نہ انگریزی خطرے سے نجات کی صورت ہو گی اور نہ جاپان خطرے کا علاج ہو سکے گا۔ ہم لڑیں گے اور فیصلہ غیروں کے ہاتھ میں ہو گا۔"

"جہاں تک مسٹر راجگوپال اچاریہ کے زیر بحث نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے گاندھی جی نے فرمایا ہے کہ "قارئین جانتے ہیں کہ میں .... الخ (مندرجہ صفحہ ۲۳۵)

(۳۳)

"ہندوستان سے چلے جاؤ"

جون ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے انگریزوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندوستان سے چلے جاؤ (Quit India) یہ تحریک زوروں پر چلنے لگی۔ اس تحریک کا ہمارے مضامین زیر بحث سے کچھ زیادہ تعلق نہیں سوائے اس کے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ "ہندوستان سے چلے جاؤ" کی تحریک ایسے حالات میں جاری کی گئی جبکہ ہندو مسلم مسئلہ کا کوئی حل تلاش نہ کیا جا سکا تھا بلکہ گاندھی جی فرما چکے تھے کہ جب تک برطانیہ موجود ہے یا جاپان کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے کوئی تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ ان حالات میں کانگرس اپنی تنہا قوت کے بھروسے پر حکومت ہند و برطانیہ سے ٹکر لینے کے لئے آمادہ ہو رہی تھی تاکہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے چلے جانے پر مائل یا مجبور کر سکے۔

مسلم لیگ کے لیڈروں نے اس نعرے کو نہ فقط حکومت برطانیہ بلکہ

مسلم لیگ کیلئے بھی ایک چیلنج قرار دیا اور کہا کہ گاندھی جی اور ان کے رفیق انگریزوں پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ پاکستان کو ٹھکرا کر ہندوستان میں کانگرس کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کریں۔

کانگریس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے گاندھی جی کے نقطۂ نگاہ کو قبول کیا اور بالآخر ۸ راگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے گاندھی جی اور مجلس عاملہ کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ حکومت ہند نے گفت و شنید کا دروازہ بند کرتے ہوئے کانگرس کے رہنماؤں کو سول نافرمانی کی دھمکی کی بنا پر جیل میں ڈالا اور ہندوستان میں فسادات ہوئے۔

سر فیروز خاں کی سکیم

اگست ۱۹۴۲ء میں علیگڈھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے سر فیروز خاں نون نے ہندوستان کو پانچ حصّوں میں تقسیم کرنے اور پھر پانچوں حصّوں کو ایک مرکز کے ماتحت لانے کی سکیم اپنے سامعین کے سامنے رکھی۔ پانچ حصّے یہ بتائے گئے:-

(۱) بنگال اور آسام (۲) سی۔ پی۔ یو۔ پی اور بہار (۳) مدراس (دراوڑ) (۴) بمبئی (مرہٹہ) (۵) پنجاب، بلوچستان، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور مرکز سے مذکورہ ذیل مضامین کو متعلق قرار دیا گیا۔

(۱) دفاع (۲) محصول درآمد و برآمد (۳) امور خارجہ اور (۴) سکّہ۔

یہ سکیم نہ ہندوؤں کو قبول ہوئی اور نہ مسلم لیگ کے لیڈروں نے اسے قابل توجہ سمجھا۔

مہاسبھا کی قرارداد

۱۳ر اگست ۱۹۴۲ء کو ہندو مہاسبھا نے ایک طویل قرارداد میں کانگرس کے مطالبات کی حمایت کی مگر اس کے ساتھ ہی وفاقی حکومت بنانے اور پاکستانی تخیل کو گرانے کی طرف قدم بڑھایا۔ اس طرح مہاسبھا کانگرس کو مضبوط بنانے کے لئے میدان میں نکلی اور اس نے ایسا مطالبہ کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ سب کچھ ہمیں دیدو۔ اس نے تو یہاں تک کہدیا کہ پاکستانی نظریہ رکھنے والوں کو مرکزی حکومت میں ہی نہ لیا جائے۔ اور اس طرح کانگرس کے بعض لیڈروں نے جو کہا تھا کہ برطانیہ مسٹر جناح کو ہی مرکزی حکومت بنانے کے لئے کہے اس کی بھی مخالفت کردی

مُسلم لیگ

مسلم لیگ اس سارے دور میں اتحادی فتح کے بعد ہندوستان میں پاکستان قائم کرنے کا مطالبہ کرتی رہی اور دورانِ جنگ میں اس نے اتنا ہی مطالبہ کیا کہ پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ مسٹر ایمری اور دوسرے برطانوی مدبروں نے اور بعض دفعہ ہندوستان کے برطانوی حکام نے ایسے الفاظ کہے جن سے پاکستان یا پاکستانیوں کی تائید ہوتی تھی۔ تاہم مسلم لیگ کا پاکستان انگریزی اقتدار کے سائے میں بنایا جانا مقصود معلوم ہوتا ہے۔

وائسرائے اور راجگوپال اچاریہ

لارڈ لنتھگو نے مسٹر راجگوپال اچاریہ کو ۱۹۴۲ء کے موسم سرما میں ایک ملاقات کا شرف بخشا اور اچاریہ جی نے بعد میں ہندو مہاسبھا اور لبرل جماعت کے لیڈروں سے کہنا شروع کیا کہ وہ پاکستان کی تائید کریں۔ انہوں نے انکو وائسرائے کے بعض

کلمات بھی کہہ سنائے۔ کچھ توقعات پیدا ہو رہی تھیں کہ وائسرائے نے کلکتہ میں یورپین چیمبر آف کامرس کی دعوتِ طعام کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کو جغرافیائی وغیرہ حیثیتوں سے ایک ملک قرار دیا۔ اس پر اچاریہ جی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے وائسرائے کے بیان پر کڑی نکتہ چینی کی۔ انہیں شکوہ ہوا کہ وائسرائے نے انہیں تو کہا کہ ہندوستان میں السٹر سازی کا دور طے کرنا ہی پڑیگا اور جب اچاریہ جی نے مہا سبھا اور دوسرے ہندو حلقوں کو کسی قدر مائل کر لیا کہ وہ پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیں تو وائسرائے نے پاکستان کے خلاف تقریر کرکے پھر ہندوؤں کو اکھنڈ بھارت کے حق میں اکسا دیا۔ اچاریہ جی کو وائسرائے کی یہ دورُخی چال بہت بُری معلوم ہوئی۔

مجلسِ احرار کا نقطہ نگاہ

اپریل ۱۹۴۳ء میں مجلس احرار نے اپنی قرارداد سہارنپور میں پاکستان، اکھنڈ بھارت اور آزاد پنجاب وغیرہ کے بارے میں اپنا واضح اعلان کیا۔ قرارداد کے الفاظ اپنی تشریح آپ کرتے ہیں اس لئے انہیں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔ وہ قرارداد حسب ذیل ہے:۔

"مجلس احرار اسلام ہند نے اکھنڈ بھارت۔ پاکستان اور آزاد پنجاب وغیرہ سکیموں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جنگِ عالمگیر کی تباہ کاریوں اور جنگی رقبوں سے ہزاروں میل دور علاقوں میں جنگ کے تکلیف دہ اور فتنہ زا اثرات پر دھیان دیتی چلی آئی ہے۔

مجلس تمام غور و فکر کے باوجود اپنے آپ کو اپنا پرانا مسلک چھوڑنے پر آمادہ

نہیں پاتی۔ کہ ہندوستان کی سیاست کا پیچیدہ مسئلہ بہر حال اس ملک کے رہنے والے لوگوں کے درمیان امن و اعتماد باہمی کے ذریعہ ہی حل ہو سکتا ہے۔ اس لئے مجلس اِن تمام سکیموں کے حامیوں سے بھی عرض کرنا چاہتی ہے کہ اکھنڈ بھارت، پاکستان یا آزاد پنجاب جیسی کوئی سکیم بھی باہمی اعتماد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی اور اگر کسی فریق کا یہ خیال ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے سہارے سے اپنی کوئی اسکیم منوا سکتا ہے۔ تو اسے یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے۔ کہ انگریزی بمبار کے سہارے جو سکیم بھی منوائی جائے گی۔ وہ انگریز کی غلامی پر مجبور کرے گی۔ اور اُسی وقت تک قائم رہ سکے گی۔ جب تک اس غلامی کا طوق گراں باوجود ہو۔

ایسے اکھنڈ بھارت، پاکستان اور آزاد پنجاب کے نمونے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں انگریزی حکومت کی آمد کے وقت سے موجود چلے آئے ہیں اس لئے سیاسئین ہند کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ اپنی گرم روی میں ایسے حالات پیدا نہ کریں۔ جو بالآخر چند ایک اور مجبور و محصور ریاستیں ہندوستان میں پیدا کر دیں اور بس۔

اندریں حالات مجلس احرار اسلام اپنی روش کا اظہار اِن الفاظ میں کر دینا مناسب سمجھتی ہے:-

(۱) مجلس احرار اسلام کو کسی ایسی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی جس کی کامیابی کے لئے لندن کے طواف کی ضرورت یا انگریزی سنگینوں کی احتیاج ہو۔

(۲) مجلس احرار اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہندوستان میں ایک، مرکز قائم کیا جائے۔ یا زیادہ اور اس کے صوبوں کی موجودہ تقسیم کو روا رکھا جائے یا اس میں تبدیلی کرنے کی خواہش ہو۔ ہر حالت میں صلح جویانہ عہد و پیمان اور امن و

آشتی کا ماحول ہی بہترین فیصلہ میں مدد دے سکتا ہے۔

(۳) مجلس احرار اس منافرت انگیز پراپگنڈا کو جو کسی طرف سے بھی کیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے مستقبل یا اکھنڈ بھارت یا پاکستان یا آزاد پنجاب وغیرہ کے قیام کے لئے مہلک سمجھتی ہے۔ اور اس لئے ہر اسکیم کے حامیوں سے درخواست کرتی ہے۔ کہ وہ ملک کی فضا کو مسموم کرنے والی تقریروں۔ تحریروں اور دیگر پراپگنڈا سے باز رہیں۔ اور اپنے راستے میں خود ہی کانٹے نہ بوئیں۔

(۴) مجلس احرار اسلام زمانہ کے موجودہ حالات میں فیصلہ کر چکی ہے کہ اب ہمیں ملک کو اندرونی فساد کے فرقہ وارانہ یا اقتصادی خطروں سے بچانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اسی کام پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔ پس جہاں مجلس اس وقت حکومت سے متصادم نہیں ہے۔ وہاں وہ مذہبی یا سیاسی اختلاف کی بنا پر بھی کسی فریق یا جماعت سے تصادم مناسب نہیں سمجھتی۔ اور جہاں وہ ہندو، سکھ یا عیسائی وغیرہ سے تصادم یا فتنہ انگیز اختلاف مناسب نہیں سمجھتی۔ وہاں وہ مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی پیدا کرنا ہرگز ہرگز تصور نہیں کرتی۔

(۵) گو مجلس موجودہ وقت میں حکومت برطانیہ سے کوئی مطالبہ کرنا پسند نہیں کرتی اور اپنی قسمت کو اللہ کے سپرد کرنا زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ پھر بھی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں یا مسلم لیگ اور کانگرس کے سمجھوتہ کی راہ میں سنگ گراں بننے کی خواہش مند نہیں ہے۔ اسے ایسے سمجھوتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔ تاہم جو لوگ اس وقت سمجھوتہ کی کوشش کرنا چاہیں۔ وہ اُن کو روکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ ان حالات میں وہ سمجھوتہ کی علیحدہ کوشش کر کے مسلمانوں میں باہمی خلفشار کو ہوا دینا نامناسب سمجھتی

ہے۔اور واضح کردینا چاہتی ہے۔ کہ جو کوئی سمجھوتہ چاہتا ہے۔ وہ بے شک مسلم لیگ سے اور جس کسی جماعت سے چاہے باتیں کرے۔ لیکن وہ مجلس احرار سے امید نہ رکھے کہ وہ ایسے مخمصوں میں پھنس کر مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی کا دروازہ کھولے گی۔

(۶) مجلس احرار اسلام واضح کردینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں ہے۔ کہ کسی جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا یا برقرار رکھنا مسلمان کا مذہبی یا حقیقی اور قطعی فریضہ ہے۔ بلکہ ہر حالت میں خدا و رسول کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا دنیا میں نیکی سے رہنا۔ نیکی سے تعاون کرنا۔ نیکی کی حکومت قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا ہی خلقتِ انسان کی خداوندی حکمت و مصلحت ہے۔ اور مجلس احرار اسلام دنیا کے جس حصہ میں بھی ممکن ہو۔ حکومت الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے۔ تاکہ دُنیا کو دکھایا جاسکے کہ اسلام کے زرّیں اصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ اور دُنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس ضمن میں مجلسِ احرار یہ واضح کردینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ کسی علاقہ میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آجانا حکومت الٰہیہ کا مترادف نہیں بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے رہیں، اسلام کے روئے روشن پر دھبہ لگایا۔ اور دُنیا کو اسلام سے متنفّر ہونے کی گنجائش دی۔ مجلس کسی ایسے تجربہ کو دھرانے کے لئے مسلمانوں کی دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ میں حکومت دے کر مطمئن نہیں ہوسکتی۔ اور وہ مسلمانوں سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا فوری اور کلی احساس کریں۔ اور اپنی نگاہ سے حکومت الٰہیہ کو اوجھل کرکے اسلام کے

نام پر الحاد و زندقہ کے فروغ کا موقع نہ دیں۔ بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعت خدا و رسول پر کمر بستہ ہونے کی تلقین و تاکید کریں۔"

مسلم لیگ کی قرارداد

اسی زمانہ میں مُسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ایسٹر کے ایام میں دہلی میں ہوا۔ یہاں ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ دسمبر سے پہلے پہلے پاکستان کے اصول کو تسلیم کرے ورنہ کرسمس میں مسلم لیگ عملی قدم اٹھانے کے لئے خاص اجلاس میں غور کرے گی۔

لنلتھگو اور ویول دونوں نے پاکستانی اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے ہندوستان میں وفاقی حکومت کے قیام پر زور دیا اور اس طرح مسلم لیگ کے چیلنج کو قبول کیا۔ مسلم لیگ نے کراچی میں دسمبر ۱۹۴۳ء میں پھر خاص اجلاس منعقد کیا۔ اور ایک مجلسِ عمل بنائی۔ لیکن اس مجلس عمل نے تعلیمی، تجارتی اور صنعتی ترقی اور ٹائپ اور شارٹ ہینڈ وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلانا مناسب سمجھا۔ وہ حکومت سے ٹکرانے کا کوئی فیصلہ نہ کر سکی اور دلی کے بلند بانگ دعوے سب ختم ہو کر رہ گئے۔ مسٹر جناح نے کراچی میں "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" کا نعرہ لگایا۔ لیکن اس نعرہ کی تائید میں کوئی ولولہ پیدا نہ کر سکے۔

جناحی نقطہ نظر کی وضاحت

لندن کے اخبار "نیوز کرانیکل" کے نامہ نگار نے ۲۹ فروری ۱۹۴۴ء کو مسٹر جناح سے نئی دلی میں ملاقات کی اور ان کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت چاہی۔ میں چند ایک متعلقہ سوالات و جوابات کو نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں :-

سوال۔ اچھا تو کیا کیا جانا چاہیئے؟

جواب۔ اگر برطانوی حکومت واقعی خلوص دل سے ہندوستان میں امن کی خواستگار ہے تو اسے ایک جدید آئین مرتب کرنا چاہیئے اور ہندوستان کو دو جداگانہ ریاستوں میں بانٹ دینا چاہیئے۔ ایک پاکستان مسلمانوں کے لئے جو ملک کا ایک چوتھائی ہو اور دوسرا ہندوستان ہندوؤں کے لئے جو کل ہندوستان کا تین چوتھائی حصّہ ہوگا۔

اس سوال کے بعد نامہ نگار نے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش اور دفاع کی کمزوری کا ذکر کیا اور مسٹر جناح نے اپنا نقطہ نگاہ پیش کیا آخر کار نامہ نگار نے پاکستان کے قیام کی صورت میں پیش آنے والی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا:۔

"لیکن خانہ جنگی یقیناً ہو گی۔ آپ ایک ایسا ہندوستانی السٹر قائم کرینگے جس پر کسی نہ کسی روز ہندو متحدہ ہندوستان کے نام پر حملہ کر دیں گے۔

مسٹر جناح نے فرمایا۔ میں اس سے اتفاق نہیں رکھتا۔ لیکن نئے آئین کے ماتحت ایک ایسا درمیانی دور آئے گا جس میں مصالحات و ملحقات کے امور طے ہونگے۔ اس دَور میں برطانوی حکومت جہاں تک اس کے مسلح فوجی دستوں اور خارجی معاملات کا تعلق ہے حاکم مطلق رہے گی۔ اس درمیانی مدّت کی طوالت اس رفتار کی تیزی پر موقوف رہے گی جس رفتار سے یہ دونوں قومیں اور برطانوی حکومت نئے آئین سے مطابقت کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سوال۔ اس وقت کیا ہوگا جب برطانیہ اس بہانے پر ہندوستان چھوڑنے

سے انکار کردے کہ پاکستان اور ہندوستان کے باشندوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ اور یہ دونوں اچھے ہمسایوں کی مانند نہیں رہیں گے۔

جواب۔ ایسا ہو سکتا ہے مگر ایسا قرینہ نہیں ہے۔......

مسٹر جناح کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ کراچی میں "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" کا نعرہ لگانے کے بعد وہ انگریزوں کا ہندوستان سے چلے جانا پسند نہیں کرتے بلکہ مسلح فوجی دستوں اور خارجہ معاملات کے تعلق میں انہیں حاکم مطلق کے طور پر ہندوستان میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اس اُمید میں ہیں کہ برطانیہ خود بخود یہاں سے چلے جانے پر آمادہ ہوگا اور ہمارے اختلافات کو بہانا بنا کر یہیں ٹھیرا رہے گا۔

اس طرح مسٹر جناح کا پاکستان انگریزی سنگینوں کی امداد کا محتاج ہوگا اور مسٹر جناح یہ بھی نہیں فرما سکے کہ وہ خود انگریزوں کی مدد کے بغیر پاکستان کو ناپاکستان سے بچالیں گے۔ کرسی نشین لیڈروں سے زیادہ توقع بھی بیکار ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدشات جن کا اظہار مجلس مرکزیہ احرار نے سہارنپور میں کیا تھا وہ بالکل درست ثابت ہوئے اور مسٹر جناح انگریزی سائے میں پاکستان کا خواب دیکھ رہے ہیں جو اہل خرد کے نزدیک ہندوستان کے مسئلے کا کوئی قابلِ قبول حل نہیں۔

ہندوستانی مسئلہ اس طرح لڑھکتا چلا آ رہا تھا کہ مسٹر جناح نے لاہور میں آ کر یونینسٹ وزارت کو مسلم لیگ وزارت کا نام دینا چاہا۔ مگر یہاں بھی غیر مسلم وزرا نے پاکستان کی وضاحت چاہی۔ مسٹر جناح واضح جواب دینے سے قاصر رہے اور پنجاب میں مسلمانوں کے دو ٹکڑے ہو گئے جو کل تک مسٹر جناح کے ساتھ تھے۔ بنگال میں پہلے

ہی ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں صوبے ہی پاکستان کی بنیاد ہیں ان کے بغیر کوئی نام کا پاکستان بھی چل نہیں سکتا۔ مسٹر جناح کی لفظی فتوحات کے جذبہ شدید نے دونوں جگہ انتشار و تصادم پیدا کر کے اپنے راستے میں ایسے کانٹے بوئے ہیں جن سے ان کا اپنا راستہ روز بروز دشوار ہوتا چلا جائے گا۔ کرسی نشین لیڈر لفظی فتوحات چاہتے ہیں اور اس لئے ایسی لڑائی لڑتے ہیں جس کا لڑنا غیر ضروری ہو مگر وہ اس سے بہتر میدان کے سپاہی ہی نہیں ہوتے اس لئے بنا بنایا کھیل بھی بگاڑ بیٹھتے ہیں۔

آج ہم ہندوستانی سیاسیات کے اس دور سے گزر رہے ہیں اور جنگ عالمگیر کے اثرات ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ جو لوگ امن میں آرام سے سوچ نہ سکے وہ جنگ کے شعلوں میں غور کرنے کے لئے ٹھنڈا دل کہاں سے لائیں گے۔ ہمارے عشق میں سیاست نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مکتبۂ احرار

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو روز بروز، ایک ہمہ گیر زبان کی صورت اختیار کر رہی ہے اور ہمارے اچھے اصحاب قلم اپنی مرصع اور مشکور مساعی سے جدید شاہراہ خیال کو صحت مند بنا رہے ہیں! — حتیٰ کہ معیشت و معاشرت، تمدن و تہذیب، سیاست و ثقافت اور تواریخ و فلسفہ کی بوقلموں شاخوں پر خالص اُردوانہ انداز میں سوچا اور کہا جا سکتا ہے — اور ہمارے الفاظ کا ذخیرہ اتنی خوبصورتی کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ "سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے" فی الحقیقت ایک لافانی سچائی نظر آتی ہے۔

جہاں تک ادب و شعر کی رومانوی زندگی کا تعلق ہے ہمارا سرمایہ دوسری زبانوں سے بہت آگے ہے البتہ سیاسیات کا موضوع کافی حد تک شرمندۂ تکمیل ہے اور بالخصوص عملی سیاسیات کے تحریری مباحث تو ہنوز روز اوّل کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ مکتبہ احرار کے قیام کی غایت، سیاسیات ملکی و ملی کے انہیں پہلوؤں کی نمائش ہے — یہ خالص سیاسی اشاعتی ادارہ ہے، اس کے لکھنے والوں میں ایسے لوگ شامل ہیں، جو دل کے دلیر، طبیعت کے شیر، قلم کے ادیب اور حوادثات سے بیباکانہ گذرے ہیں

مدبّر — راہنما — ادیب — شاعر — قیدی — صحافی

مکتبہ احرار ان دماغوں کے افکار پیش کرے گا

اس کی سرپرستی آپ کا فرض ہے

خطباتِ احرار

قائدِ احرار چودھری افضل حق مرحوم اور مولانا مظہر علی صاحب اظہر

کے صدارتی خطبات کا مجموعہ

ان خطبات میں سیاسیاتِ حاضرہ کے اُن تمام پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے جو پچاس سالہ تاریخ ہند کا جزوِ لاینفک ہے۔

اس کتاب کی افادی حیثیت کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ہندوستان کا سیاسی ماحول انہیں افکار کی صدائے بازگشت ہے جو ان دو عظیم دماغوں نے ماضی بعید میں، راہنمایانہ اقتضا پر سپردِ قلم فرمائے تھے۔

ہر سیاسی طبع، ہر سیاسی ادارہ، ہر سیاسی جماعت اور ہر سیاسی لائبریری میں اس کتاب کا ہونا اشد ضروری ہے۔

اس مجموعے کے مرتب آغا شورش کاشمیری ہیں، جن کی ابتدائی تصریحات نے حسنِ ترتیب کی قدر بڑھا دی ہے۔

حجم ۲۰۸ صفحات ~~~~~~~~ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:۔

مکتبہ ——— احرار ——— لاہور

احرار راہنما

چودہری افضل حق مرحوم
سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
مولانا غلام غوث سرحدی
حافظ علی بہادر خاں
سردار محمد شفیع

مولانا مظہر علی اظہر
شیخ حسام الدین
شہید مولانا گل شیر خان صاحب رح
صاحبزادہ فیض الحسن شاہ
خان محمود علی خان
خواجہ عبدالرحیم عاجز

وغیرہ کے سوانح حیات

آغا شورش کاشمیری نے اپنے بہار آفریں قلم سے ان ایثار پیشہ راہنمایانِ احرار کی منہ بولتی تصویریں بنائی ہیں اور ہر شخصیّت کے سوانح حیات میں ان کے اعزہ و احباب کی زندگی بھی جھلکتی ہے۔

بقول علامہ تاجور نجیب آبادی مترنم الفاظ، دلنشیں مطالب اچھوتے استعارے، نادر تشبیہیں اور رعنا فقرے خود مصنّف کی سیرت کا شاعرانہ خاکہ ہیں۔ (زیر طبع)

انقلابی عشرہ

مترجمہ شیخ حسام الدین صدر مجلس احرار اسلام ہند

(Ten days that shook that world)

یہ کتاب روس کے انقلابی عشرہ کی ضخیم داستان ہے، ہندوستان کے انقلابی نوجوان رہنما شیخ حسام الدین نے سلیس و بامحاورہ ترجمہ کرکے اُردو ادب پر گرانمایہ احسان کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کے میدان میں سرخ انقلابی تلواریں سونتے کھڑے ہیں۔ مطالب کی وادیوں میں دم توڑتی ہوئی سرمایہ داری کراہ رہی ہے۔ اور واقعات نے اپنی رنگینی کے لئے سامراجی تخت و تاج کا لہو استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اس ترجمہ کا دیباچہ رقم کیا ہے۔ جو خود ایک انقلابی مصوّری ہے۔

(زیر طبع ہے)

مضامینِ افضل حق

مفکرِ مشرق چوہدری افضل حق صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں جو مذہبی اور ملکی تجربات حاصل کئے، آپ نے بسا اوقات اُن کا اظہار ملک کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں کیا۔ آپ کے گراں مایہ مضامین جو ہر ایک مسلمان کے لئے مشعلِ راہ ہیں اور جن کے اندر اسلام کی خدمت اور آزادئ وطن کے جذبات کے پرتو نظر آتے ہیں ایک جگہ کتابی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

میرا افسانہ حصّہ دوم

چوہدری افضل حق صاحب مرحوم نے "میرا افسانہ" کے عنوان سے اپنی زندگی کے حالات بڑی محنت اور کاوش سے قلمبند فرمائے تھے۔ چوہدری کی اس آپ بیتی کے مطالعہ سے ایک بلند پایہ مفکّر کے اُن ذہنی رجحانات کا بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے جو سیاسی کارکن کی زندگی میں مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ "میرا افسانہ" کا پہلا حصّہ قبل ازیں شائع ہو چکا ہے۔ کونسل میں داخلہ کے بعد کے حالات حصّہ دوم کی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں جس میں چوہدری صاحب کی شاعری کے نمونے بھی نظر آئیں گے۔ (زیر طبع)

مکتبۂ ــــــ احرار ــــــ لاہور

(اس کتاب کیلئے، رم کاغذ میسرز منبسی دھر کپور سوداگرانِ کاغذ لاہور سے کنٹرول ریٹ پر حاصل کئے گئے)